ذوالحجہ ۱۴۴۴ھ
جولائی ۲۰۲۳ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ہجری سالِ نو مبارک

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کربلا کی کہانی : حضرت ابوجعفر محمد باقرؒ کی زبانی

داعی رجوع الی القرآن؛ بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

○ خوبصورت ٹائٹل ● سفید کاغذ ○ معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

○ قرآنی رسم الخط ○ تفسیری سائز ○ عمدہ سفید کاغذ ○ مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	72
شمارہ	:	7
ذوالحجہ		1444ھ
جولائی		2023ء
فی شمارہ	:	50 روپے
سالانہ زرِ تعاون	:	500 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ **عرضِ احوال** ——— 5

معیشت کی ''کلینکل ڈیتھ'' ہو چکی! ایوب بیگ مرزا

❁ **بیانُ القُرآن** ——— 9

سورۃ المدّثّر ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **تذکرہ و تبصرہ** ——— 27

ہجری سالِ نو مبارک ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **تازہ خواهی داشتن** ——— 34

کربلا کی کہانی ترجمہ: مولانا عطاء اللہ حنیف

❁ **ذبحِ عظیم** ——— 41

سُنّتِ ابراہیمی اور فریضۂ قربانی راحیل گوہر صدیقی

❁ **تذکّر و تدبّر** ——— 48

الصَّلٰوۃُ الوُسطٰی انجینئر مختار حسین فاروقیؒ

❁ **حقیقتِ دین** ——— 57

حکم صرف اللہ کا! میاں محمد جمیل

❁ **انوارِ ھدایت** ——— 66

اچھا کون، بُرا کون! پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

❁ **تعمیرِ سیرت** ——— 73

صلہ رحمی مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت

❁ **تهذیبِ اطفال** ——— 79

اسلامی معاشرت میں بچوں کا مقام مولانا عبدالمتین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

معیشت کی ’’کلینکل ڈیتھ‘‘ ہو چکی!

وسائل اُس وقت بھی انسان کو کسی نہ کسی صورت میں تقویت دیتے تھے جب اجتماعیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ پھر جوں جوں انسان اجتماعیت کے مراحل طے کرتا رہا تو وسائل جنہیں اب اقتصادیات کہنا چاہیے‘ کا کردار نجی اور اجتماعی سطح پر بڑی تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ آج منظّم اجتماعیت ایسی سطح پر پہنچ چکی ہے کہ ظاہری طور پر اس کا اگلا مرحلہ یا بلندی نظر ہی نہیں آ رہی۔ بالفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے‘ واللہ اعلم! اس پس منظر میں اب انفرادیت اپنا وقت پورا کر کے بڑی بڑی ریاستوں میں ڈھل چکی ہے۔ اقتصادی قوت کو آج دنیا میں (جسے اب گلوبل ویلیج کہا جاتا ہے) وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو حاصل ہوتی ہے۔ کسی بھی کام کو سرانجام دینے میں انسان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا کردار ہوتا ہے۔ جس طرح ان صلاحیتوں سے محروم انسان معذور کہلاتا ہے اسی طرح اقتصادی طور پر بہت زیادہ کمزور ریاست معذور ہوتی ہے۔ جس طرح معذور انسان زندگی اپنی مرضی کے تحت نہیں گزار رہا ہوتا بلکہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اسی طرح معاشی لحاظ سے ایک کمزور ریاست کو بھی دوسری طاقتیں اپنے مفاد کے مطابق چلا رہی ہوتی ہیں۔ جہاں اور جب چاہا سہارا دے دیا اور جب چاہا بے سہارا کر دیا۔

کون اتنا کُند ذہن ہوگا کہ جو یہ نہ سمجھے کہ یہاں بات پاکستان کی ہو رہی ہے۔ پاکستان کی معاشی معذوری اور اُس کے نتائج پر بات کرنے سے پہلے اس حقیقت کی تاریخ سے مثال دینا واجب ہے کہ معاشی اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہوئے بغیر عسکری اور دفاعی مضبوطی کا تصور ہی احمقانہ ہوگا۔ ایک وقت تھا جب سویت یونین کی عسکری قوت سے امریکہ اور مغربی یورپ لرزہ براندام تھے۔ نیٹو (NATO) کو تو وجود میں ہی اس لیے لایا گیا تھا کہ مل جُل کر سویت یونین کی قوت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ البتہ معاشی اور سیاسی حوالوں سے کمیونسٹوں کی غلط پالیسیوں نے اس

سپر پاور کی اقتصادی کمر توڑ دی۔ یوں اقتصادی اعتبار سے جو زلزلہ آیا اس نے سوویت یونین کی وحدت کو پاش پاش کر دیا اور وہ شکست و ریخت کا شکار ہو کر روس تک محدود ہو گیا۔ اُس وقت سوویت یونین کے پاس اس قدر ایٹمی قوت تھی کہ وہ پوری دنیا کو سینکڑوں مرتبہ ملیا میٹ کر سکتا تھا لیکن اقتصادی کمزوری نے اُسے مفلوج کر دیا۔ چنانچہ عسکری قوت اُسے ایک معاشی قوت نہ بنا سکی۔ ریاست اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکی اور دھڑام سے زمین پر آ گری۔

اس کے برعکس تاریخ ہی سے ایک مثال لے لیں۔ ماؤزے تنگ کے انقلاب سے پہلے چین افیونیوں کا ملک کہلاتا تھا۔ رقبہ اگرچہ بہت بڑا تھا اور گنجان آباد بھی تھا لیکن دنیا میں اُس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ انقلاب کے بعد بعض اصلاحات ہوئیں لیکن چین ٹیک آف نہ کر سکا‘ اس لیے کہ ماؤزے تنگ کوئی انقلابی معاشی پالیسی نہ دے سکے۔ جب ڈینگ ژیاؤ پنگ نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو حکومت نے ایسی انقلابی معاشی پالیسیاں دیں کہ عوام کی قسمت ہی بدل گئی۔ اب وہ ایک محنتی قوم تھی۔ کم از کم موجودہ عالمی تاریخ تو ایسی کوئی مثال دینے سے قاصر ہے کہ کسی قوم نے اس قدر گھمبیر زوال سے عروج کی طرف ایسی سُبک رفتاری سے منازل طے کرنا شروع کر دی ہوں۔ اس عمل میں چین کی سیاسی پالیسیوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً تائیوان کے وجود کو اور ’’ون چائنا‘‘ موقف کو زندگی اور موت کا مسئلہ تو قرار دیا گیا لیکن اسے اپنی خواہشات کے مطابق حل کرنے کے لیے کسی صورت جنگ کا آپشن نہ رکھا۔ امریکہ اگرچہ اس حوالے سے اشتعال دلاتا رہا‘ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جنگ چین کی معاشی ترقی پر بُری طرح اثر انداز ہوگی۔ تائیوان کا مسئلہ چین نے سفارتی سطح پر زندہ رکھا لیکن اپنی جغرافیائی سرحدوں کے گرد ’’آئرن کرٹن‘‘ تان کر معاشی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی سے چین کے پاؤں جم گئے۔ اسلحہ سازی اور دفاعی ساز و سامان کی تیاری اگرچہ پہلے بھی چل رہی تھی لیکن دولت کی فراوانی کے باعث اب اس طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ نئی اور جدید ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اس طرح چین پہلے اقتصادی جن بن کر سامنے آیا اور پھر ایک زبردست عسکری قوت بن گیا۔ آج وہ اقتصادی اور دفاعی دونوں محاذوں پر اپنے مخالفین کے لیے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ امریکہ جو سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ پر ’’سپریم پاور آف دی ورلڈ‘‘ یعنی دنیا کی واحد سپر پاور بن کر عالمی حکمران کی حیثیت اختیار کر گیا تھا‘ اُسے

اپنی یہ حیثیت بچانی مشکل ہو رہی ہے۔

اب تک ہماری تمام تر گزارشات کی حیثیت ایک ابتدائیہ کی سی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ساری توجہ کا مرکز اور ہمارا اصل موضوع تو پاکستان ہی ہے۔ معاشی اور اقتصادی لحاظ سے پاکستان کبھی بھی ایک مضبوط اور مستحکم ملک نہ کہلا سکا۔ گزشتہ پون صدی میں کچھ ایسے مختصر دورانیے آئے کہ ہماری اقتصادی صورتِ حال قدرے تسلّی بخش تھی لیکن موجودہ کمزور‘ لاغر اور ناتواں معاشی حالت نہ تو قیام پاکستان کے وقت تھی اور نہ پاکستان کے دولخت ہونے پر۔ ہر طرف سے ''ڈیفالٹ ڈیفالٹ'' کی پکار پڑی ہے اگرچہ جناب وزیراعظم اور وزیرخزانہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر اُن کی بات مان بھی لی جائے کہ ہم ابھی تک قانونی طور پر ڈیفالٹ نہیں ہوئے تو خدارا بتایئے کہ یہ صورت حال کس امر کی عکاس ہے: درآمدی مال بندرگاہوں پر پڑا ہے جسے چھڑانے کے لیے ہمارے پاس زرمبادلہ نہیں ہے۔ اوسط افراطِ زر ۳۸ فیصد تک پہنچ چکی ہے جبکہ اشیائے خورد و نوش کے لیے ۴۸ فیصد تک ہے۔ شرح نمو ۲۔۰ فیصد ہے۔ زرمبادلہ کے ذخائر محض تین سے چار ارب ڈالر کے درمیان ہیں۔ معیشت کی یہ ساری تباہی گزشتہ ایک سال میں آئی ہے‘ وگرنہ ۲۲-۲۰۲۱ء کی شرح نمو ۶.۱ فیصد تھی اور اس وقت زرمبادلہ کے ذخائر ۱۷ سے ۱۸ ارب ڈالر تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بدترین معاشی پالیسی کی وجہ سے آج شرح سود ۲۲ فیصد ہو چکی ہے۔ گویا ریاست اعلانیہ طور پر کہہ رہی ہے کہ کوئی صنعت نہ لگاؤ‘ بنکوں میں پیسہ جمع کراؤ اور گھر بیٹھ کر آرام سے حرام کھاؤ۔ اس طرح نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ لیبر کے پیدا کردہ مسائل کا سامنا‘ نہ کوئی ٹیکس اور مختلف محکموں کے چھاپوں کا مسئلہ۔ ایسی پالیسیوں کا بالآخر انجام کیا ہوگا‘ یہ سوچ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

اگرچہ پاکستانی پہلے بھی روزگار کی تلاش میں ملک سے باہر جاتے تھے‘ قانونی طور پر بھی اور غیر قانونی طریقوں سے بھی‘ لیکن گزشتہ ایک سال میں جتنے پاکستانی رزق کی جستجو میں بیرونِ ملک گئے ہیں شاید گزشتہ دس سالوں میں بھی نہ گئے ہوں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مہنگائی اور بیروزگاری نے پاکستانیوں پر زندگی کو بوجھ بنا دیا ہے۔ پھر یہ کہ سیاسی عدم استحکام اور اُس کے نتیجہ میں پکڑ دھکڑ سے شہری بدترین گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔ ایسے میں جستجوئے رزق اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے ایک ہی کشتی کے ڈوبنے سے تین سو پاکستانیوں کا جان سے جانا کوئی

چھوٹا سانحہ نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ معاشی لحاظ سے ہماری clinical death ہو چکی ہے' چاہے اعلان نہ بھی ہو۔ صورتِ حال کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارا قانونی طور پر بھی ڈیفالٹ کر جانا بہتر نظر آتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ پاکستان واحد اسلامی ایٹمی ملک ہے' اور دشمن اس تاک میں ہے کہ کسی طرح پاکستان کو ایٹمی اثاثہ جات سے محروم کر دیا جائے۔ اگرچہ اس سے پہلے دنیا کے کئی ملک ڈیفالٹ کر چکے ہیں اور اُن کا ایسا کچھ نہیں بگڑا' لیکن اُن میں سے نہ کوئی ایٹمی ملک تھا نہ اسلامی۔ ہم اگر قانوناً ڈیفالٹ کریں گے تو دشمنوں کو ہمارے ہاتھ پاؤں باندھنے کا موقع مل جائے گا۔ پھر ہم جو چاہیں چیخ و پکار کرتے رہیں' امریکہ اور مغرب کو ہمارے ایٹمی اثاثہ جات کی طرف بڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے کوئی راستہ نکال لیں گے۔ عالمی قوانین اُن کی مٹھی میں ہیں' جس قانون کا جو چاہیں مطلب نکال لیں۔ کیا ماضی قریب میں یہ نظیر قائم نہیں ہوئی کہ عراق میں WMD کی موجودگی کی جھوٹی دوہائی دے کر حملہ کر دیا گیا۔ مغرب اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے بڑی آسانی سے کوّے کو سفید ثابت کر سکتا ہے۔ ہمیں ہوش کرنے کی ضرورت ہے' سنبھلنے کی ضرورت ہے۔ ملک میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور کچلنے کی بجائے خدارا بیرونی دشمنوں سے ملک بچانے کی کوشش کریں۔ یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم مانگ کر کھاتے رہیں گے۔ اس ساری صورتِ حال سے بچنے کا ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ ہم انفرادی طور پر حقیقی مسلمان بن جائیں اور پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بنا دیں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو! ❁❁❁

ماهنامه "میثاق" لاهور

داعیِ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان' ایک علمی' دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین' تعلیمی اداروں' لائبریریوں' مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست' احباب اور اعزہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّرِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المدثر اور سورۃ المزمل کی باہمی مشابہت و مناسبت ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے الفاظ ﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اور یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ﴾ سے واضح ہے۔ان دونوں آیات میں حضور ﷺ کو چادر‘ کمبل یا لحاف چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔اس حوالے سے سورۃ المزمل میں قیام اللیل کے اہتمام کی ترغیب ہے تو اس سورت میں قیام النہار (عملی محنت اور مشقت) کی تیاری کا حکم ہے۔حضور ﷺ اگرچہ پہلے سے ہی معراجِ انسانیت کے درجے پر فائز تھے اور اس حوالے سے آپؐ کو ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝﴾ (نٓ) کی سند بھی عطا ہو چکی تھی‘ لیکن قیام اللیل کی ریاضت کا مقصد یہ تھا کہ رات کی تنہائیوں میں ترتیلِ قرآن کی مشق سے قرآن مجید آپ ﷺ کے پورے وجود میں سرایت کر جائے اور رسالت کی بھاری ذِمہ داری اٹھانے کے لیے آپؐ کی روحانی طاقت میں مزید اضافہ ہو جائے۔علّامہ اقبال نے اپنے اس مصرعے میں قرآن کی تاثیر کے اسی پہلو کا ذکر کیا ہے:’’چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود‘‘ کہ قرآن مجید جس انسان کی روح میں سرایت کر جاتا ہے اُس کی پوری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔

سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات کے بارے میں اگرچہ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے منقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ حضور ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی تھی‘ لیکن تمام اہل علم کی متفقہ رائے بہرحال یہی ہے کہ پہلی وحی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات پر مشتمل تھی۔(پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات‘ دوسری وحی سورۂ نٓ کی ابتدائی سات آیات اور تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی دس آیات پر مشتمل تھی۔) اس مغالطے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ فترتِ وحی

کے بعد وحی کا دوبارہ آغاز سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سے ہوا تھا۔ دراصل تیسری وحی کے بعد کئی ماہ تک نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اس وقفے کو سیرت نگاروں نے ''فترتِ وحی'' کا نام دیا ہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصی علوم کے بیش بہا خزانے آپؐ کو عطا فرمائے۔ نزولِ وحی میں مذکورہ وقفے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر رنجیدہ اور پریشان رہتے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی مَلَکی شکل میں نظر آئے۔ اس واقعے کی تفصیل جو احادیث سے ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن آپؐ غارِ حرا سے نیچے اتر رہے تھے تو آپؐ کو ایک آواز سنائی دی: ''یا محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو آپؐ کو کہیں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ آپؐ چند قدم آگے گئے تو پھر آواز آئی: ''یا محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم)! اس مرتبہ بھی جب پکارنے والا نظر نہ آیا تو آپؐ کو بجا طور پر گھبراہٹ اور تشویش ہوئی۔ اسی کیفیت میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید آگے بڑھے تو تھوڑی دیر بعد وہی آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔ اس پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اٹھی تو سامنے اُفق پر آپؐ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی ملکی شکل میں اس طرح نظر آئے کہ پورا اُفق ان کی موجودگی کی وجہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد آپؐ گھبرا گئے اور آپؐ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ بالکل اسی کیفیت کا سامنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی وحی کے وقت بھی کرنا پڑا تھا۔ گھر پہنچنے پر آپؐ کمبل یا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے تو اسی حالت میں آپؐ پر سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات نازل ہوئیں۔ چونکہ یہ ''فترت'' کے بعد پہلی وحی تھی اس لیے بعض روایات میں اس کا ذکر پہلی وحی کے طور پر بھی آیا ہے۔ بہرحال اس وحی کی ایک خصوصی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ''رسالت'' کا آغاز ہوا' جبکہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کے نزول کے ساتھ آپؐ کی ''نبوت'' کا ظہور ہوا تھا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ نبی پیدائشی طور پر نبی ہوتا ہے' البتہ نبی کی نبوت کا ظہور پہلی وحی کے نزول کے وقت ہوتا ہے۔

ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات (یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ اور یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ) کے مفہوم کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے سمجھنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از بعثت زندگی کے شب و روز کا مطالعہ ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اُس دور کا نقشہ ذہن میں لائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اور لڑکپن عسرت اور مشقت میں گزرا۔ باقاعدہ طور پر عملی زندگی میں قدم

رکھنے کے بعد آپؐ نے دوسروں کے سرمائے سے تجارت شروع کی۔ حضرت خدیجہ ؓ سے نکاح کے بعد جب آپ ﷺ کو مالی اعتبار سے فراغت ملی تو آپؐ نے بھرپور انداز میں تجارت کی۔ سائیکالوجی کی اصطلاح میں بات کریں تو ابتدائی زندگی کے دور میں آپ ﷺ کسی حد تک بیروں بین (extrovert) شخصیت کے حامل تھے۔لیکن حضرت عائشہ ؓ کی ایک روایت کے مطابق لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں آپؐ خلوت گزینی کو پسند فرمانے لگے تھے۔یعنی اس عمر میں آپ ﷺ کی طبیعت رفتہ رفتہ غور وفکر اور سوچ بچار یعنی دروں بین (introvert) رویے کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ کا آنا جانا بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ یوں سائیکالوجی کی ان دو اصطلاحات کے حوالے سے آپؐ کی شخصیت میں توازن کا رنگ پیدا ہوگیا۔اس حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ پوری نسلِ انسانی میں صرف ایک ہی شخصیت ایسی ہے جو بیروں بینی اور دروں بینی کے رجحانات میں کلیتاً متوازن ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت!

اب سوال یہ ہے کہ غارِ حرا میں جا کر آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب بھی حضرت عائشہ ؓ کی مذکورہ روایت میں موجود ہے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ غارِ حرا میں آپؐ عبادت کیا کرتے تھے (حضرت عائشہؓ نے ''تحنث'' کا لفظ استعمال کیا ہے' جس کی تشریح امام زہریؒ نے ''تعبّد'' سے کی ہے۔) اس حوالے سے شارحینِ حدیث نے آپ ﷺ کے تحنّث یا تعبّد کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ غارِ حرا کی خلوت میں بیٹھ کر آپؐ اپنا وقت غور وفکر اور سوچ بچار (التفکّر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ان ہی حالات میں جب آپؐ پر وحی نازل ہوئی تو ذِمہ داری کے شدید احساس کی وجہ سے آپ ﷺ کی سوچ بچار اور تشویش میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں آپ ﷺ کی چادر یا کمبل اوڑھنے کی کیفیت کا تذکرہ گویا آپ ﷺ کی زندگی کے اس مخصوص دور کا تذکرہ ہے' جس دور میں آپؐ ہر وقت فکر و تدبّر کی چادر میں لپٹے رہتے تھے۔اس حوالے سے ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ ... اور يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ...﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی (ﷺ!) آپ کے سوچ بچار کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے' اب آپ اٹھیے اور عملی جِدّ وجُہد کا آغاز کیجیے۔

مضمون کے اعتبار سے یہ سورت تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ العلق کے ساتھ اس کی خاص مناسبت اور مشابہت ہے۔

آیات ۱ تا ۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾
وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَ لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ؕ﴿۷﴾

آیت ۱ ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾﴾ ’’اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)!‘‘

آیت ۲ ﴿قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ﴿۲﴾﴾ ’’آپؐ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے۔‘‘

یہ ہے وہ کٹھن ذِمہ داری جس کے بارے میں سورۃ المزمل کی آیت ﴿اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴿۵﴾﴾ میں حضور ﷺ کو بہت پہلے اشارہ دے دیا گیا تھا‘ یعنی انذارِ آخرت کی ذِمہ داری‘ جس کے لیے تمہیدی کلمات میں قیام اللیل کے مقابلے میں ’’قیام النہار‘‘ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ دراصل انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت کے حوالے سے جو اصطلاح قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے وہ ’’انذار‘‘ ہی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کو بھی بار بار حکم دیا گیا کہ آپؐ قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو خبردار کریں: ﴿وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ﴾ (الانعام:۱۹) اے نبی (ﷺ!) آپ ان لوگوں کو بتائیں کہ قرآن مجھ پر نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو خبردار کر دوں۔ تم اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہو‘ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ یہ روح اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم امانت ہے جس کی ذِمہ داری کے بوجھ سے زمین‘ پہاڑ اور آسمان تک ڈر گئے تھے۔ اسی امانت کے حوالے سے تمہارا احتساب ہونا ہے۔ اس احتساب کے لیے مرنے کے بعد تمہیں پھر سے زندہ کیا جائے گا:

((وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا ، وَاِنَّھَا لَجَنَّـۃٌ اَبَدًا اَوْ لَـنَارٌ اَبَدًا))[1]

۱۔ بحوالہ جمھرۃ الخطب‘ ص۵۔ و فقہ السیرۃ للالبانی‘ ص۹۷۔

’’اللہ کی قسم‘ تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا‘ اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھائی اور بُرائی کا بُرائی‘ اور وہ جنّت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی!‘‘

بہرحال آیت زیر مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی دعوت کا نقطہ آغاز ’’انذارِ آخرت‘‘ ہے۔ اب اگلی آیت میں اس دعوت کے ہدف کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے حضورﷺ کی دعوت کا ہدف نہ تو خانقاہی نظام کی تشکیل ہے اور نہ ہی صرف تعلیم و تعلّم کے نظام کا قیام ہے‘ بلکہ اس کا ہدف یہ ہے:

آیت ۳ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ ’’اور اپنے رب کو بڑا کرو!‘‘

غور کیجیے! رب کو بڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو اپنی ذات میں خود ہی سب سے بڑا ہے۔ ہم انسان اس کو بھلا کیا بڑا کریں گے؟ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی عملاً تسلیم نہیں کی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو محدود اختیار عطا فرمایا تھا اس کے بل پر اس نے اُسی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ظلم اور فساد کا بازار گرم ہو گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱) ’’بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے‘ لوگوں کے اعمال کے سبب‘‘۔ چنانچہ اب جو کوئی بھی اللہ کو اپنا الٰہ اور اپنا رب مانتا ہے‘ اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پارٹی (حزب اللہ) کا ممبر اور اس کی فوج کا سپاہی بن کر لوگوں سے اُس کی بڑائی کو منوانے اور اُس کی کبریائی کو عملی طور پر دنیا میں نافذ کرنے کی جدوجہد میں اپنا تَن مَن اور دھن کھپا دے‘ تاکہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو: ﴿وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال:۳۹) ’’اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے‘‘۔ یہ ہے ’’تکبیرِ ربّ‘‘ یا ربّ کو بڑا کرنے کے مفہوم کا خلاصہ۔ گویا ان دو لفظوں میں حضورﷺ کی بعثت کا مقصد اور آپؐ کے مشن کا پورا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کی اصطلاح کی حیثیت ایک ایسی گٹھلی کی ہے جس میں سے اقامتِ دین‘ غلبۂ دین‘ اظہارِ دینِ حق‘ حکومتِ الٰہیہ وغیرہ اصطلاحات کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔

سورت کی ان ابتدائی تین آیات میں حضورﷺ کی زندگی کے اُس دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے جب آپؐ پر تفکّر و تدبّر بلکہ تشویش اور فکر مندی کا غلبہ تھا۔ غارِ حرا کے اندر پہلی وحی کا نزول

آپؐ کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا جس پر آپؐ بجا طور پر فکر مند تھے۔ پھر ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کے آئندہ حالات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ سے آپؐ کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ ؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ پہلی وحی کے واقعہ کے بعد حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کو خصوصی طور پر ان کے پاس لے کر گئیں۔ وہ صاحب بصیرت عیسائی راہب تھے۔ انہوں نے آپؐ سے غارِ حرا میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد کہا کہ آپؐ کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کاش مَیں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور ﷺ نے ورقہ بن نوفل کی اس بات پر پریشانی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ آپ ﷺ کا مطلب تھا کہ وہ سب لوگ تو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں، مجھے صادق اور امین مانتے ہیں، اور میرے قدموں میں اپنی نگاہیں بچھاتے ہیں، بھلا وہ مجھے کیوں شہر بدر کریں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے جواب دیا کہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی یہ ذِمّہ داری جس کسی کو بھی ملی اُس کی قوم اُس کی دشمن بن گئی، ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضور ﷺ سے اس ملاقات کے بعد جلد ہی ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن اُس وقت تک حضور ﷺ کو اپنی دعوت کی تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا۔ یعنی اُس وقت تک صرف آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا تھا، رسالت کی ذِمّہ داری ابھی آپؐ کو نہیں ملی تھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے انہیں ایمان کی دعوت بھی نہیں دی اور اسی لیے ورقہ بن نوفل کا شمار صحابہ میں بھی نہیں ہوتا۔

آیت ۴ ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④﴾ ''اور اپنے کپڑوں کو صاف رکھنے کا اہتمام کیجیے۔''

جس طرح آپؐ کی زندگی کا مقصد پاکیزہ ہے اسی طرح آپؐ کا لباس بھی پاک اور صاف ہونا چاہیے۔ اس آیت کی صوفیانہ انداز میں ایک تعبیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ثیاب'' سے صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار بھی مراد ہے۔ گویا اس حکم میں ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت بھی شامل ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۝۵﴾ ’’اور ہر قسم کی گندگی سے دور رہیے۔‘‘

یعنی ظاہری اور باطنی نجاستوں سے خود کو بچا کر رکھئے۔ ظاہر ہے باطنی گندگیوں میں سب سے بڑی گندگی شرک ہے۔ (اسی لیے بعض مترجمین نے الرُّجۡزَ کا ترجمہ ’’بتوں کی گندگی‘‘ کیا ہے۔)

آیت ۶ ﴿وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝۶﴾ ’’اور زیادہ لینے کے لیے کسی پر احسان نہ کیجیے۔‘‘

اس آیت کا عام اور معروف مفہوم تو یہی ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہوئے بدلے کی توقع نہ رکھو' بلکہ احسان برائے احسان کرو۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس آیت کا وہ ترجمہ پسند ہے جو مولانا اصلاحی صاحب نے کیا ہے: ’’اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر!‘‘ مَنَّ يَمُنُّ مَنًّا کے معانی احسان کرنا اور احسان جتلانا کے علاوہ توڑنے اور کاٹنے کے بھی ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اپنے ترجمے میں اسی معنی کو اپنایا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے فرضِ منصبی سے متعلق جِدّ و جُہد کو منقطع نہ کرنا' یقیناً آپؐ کی اس دعوت کے بڑے بڑے نتائج نکلیں گے۔ کچھ عرصے تک آپؐ کو انتظار تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن بالآخر آپؐ کی تحریک کامیاب ہوگی اور آپؐ کو ڈھیروں کامیابیاں ملیں گی۔

آیت ۷ ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ۝۷﴾ ’’اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔‘‘

یہ اس آیت کا وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن میں قبل ازیں متعدد بار یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ صبر کے ساتھ جب ’’ل‘‘ آتا ہے تو اس کے معنی میں انتظار کا مفہوم آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آپؐ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے اور جو بھی حکم آئے اس پر عمل کیجیے۔ سورت کا پہلا حصّہ ان ابتدائی سات آیات پر مشتمل ہے اور اس حصے میں حضور ﷺ سے خطاب تھا۔ اب اگلی آیت سے اس سورت کے دوسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ حصّہ تین مختصر آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات میں قیامت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

آیات ۸ تا ۱۰

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوۡرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ ۝۹ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ ۝۱۰

آیت ۸ ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوۡرِ ۝۸﴾ ’’جب صور میں پھونکا جائے گا۔‘‘

آیت ۹ ﴿فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌۙ۝۹﴾ ’’تو وہ دن بہت سخت دن ہوگا۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ۝۱۰﴾ ’’کافروں پر وہ ہلکا نہیں ہوگا۔‘‘

اس کے مقابل سورۃ المزمل میں قیامت کے دن کا ذکر اس طرح آیا تھا: ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَاۨ۝۱۷ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا۝۱۸﴾ ’’اب اگر تم بھی کفر کرو گے تو تم کیسے بچ جاؤ گے اُس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ آسمان اس کے ساتھ پھٹ پڑنے کو ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔‘‘

اس کے بعد سورت کے تیسرے حصّے کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان آیات کا لہجہ اور انداز بہت سخت ہے۔

آیات ۱۱ تا ۳۱

ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًاۙ۝۱۱ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًاۙ۝۱۲ وَّ
بَنِيْنَ شُهُوْدًاۙ۝۱۳ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًاۙ۝۱۴ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَۗ۝۱۵
كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًاؕ۝۱۶ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًاؕ۝۱۷ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ
قَدَّرَۙ۝۱۸ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَۙ۝۱۹ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَۙ۝۲۰ ثُمَّ
نَظَرَۙ۝۲۱ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَۙ۝۲۲ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَۙ۝۲۳ فَقَالَ اِنْ
هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُۙ۝۲۴ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِؕ۝۲۵ سَاُصْلِيْهِ
سَقَرَ۝۲۶ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُؕ۝۲۷ لَا تُبْقِيْ وَ لَا تَذَرُۚ۝۲۸ لَوَّاحَةٌ
لِّلْبَشَرِۚۖ۝۲۹ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَؕ۝۳۰ وَ مَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا
مَلٰٓىِٕكَةً ۪ وَّ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا وَّ لَا يَرْتَابَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ
اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
اِلَّا هُوَ ؕ وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ۠۝۳۱

آیت ۱۱ ﴿ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿ۙ۱۱﴾﴾ ''آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور جس کو مَیں نے اکیلا پیدا کیا۔''

ذَرۡنِیۡ کا یہ انداز ہم قبل ازیں سورۃ نٓ اور سورۃ المزمل میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا کا مفہوم یہ ہے کہ جب مَیں نے اُسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ تنہا تھا' کوئی مال' اولاد یا جائیداد وغیرہ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان آیات کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ اس شخص کی مکہ اور طائف دونوں شہروں میں بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ اللہ نے اسے بہت سے بیٹوں سے بھی نواز رکھا تھا۔

آیت ۱۲ ﴿وَّ جَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿ۙ۱۲﴾﴾ ''اور اُسے مَیں نے بہت سا مال دیا پھیلا ہوا۔''

ان الفاظ میں اشارہ ہے اس شخص کی ان جائیدادوں کی طرف جو زمینوں' باغوں' گھروں وغیرہ کی صورت میں مکہ اور طائف دونوں شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَّ بَنِیۡنَ شُہُوۡدًا ﴿ۙ۱۳﴾﴾ ''اور نگاہوں کے سامنے رہنے والے بیٹے دیے۔''

کسی کے بیٹوں کا گھر میں حاضر و موجود رہنا بھی اُس کی تونگری اور خوشحالی کی علامت ہے۔ ورنہ فکرِ معاش جوان بیٹوں کو گھر میں چین سے کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ آج ''حاضر باش'' بیٹوں جیسی نعمت کی قدر پوچھنی ہو تو ان والدین سے پوچھیں جن کے نوجوان بیٹے روزی کی تلاش میں امریکہ اور یورپ میں دھکے کھا رہے ہیں اور وہ محض انہیں ایک نظر دیکھنے کی امید پر جی رہے ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَّ مَہَّدۡتُّ لَہٗ تَمۡہِیۡدًا ﴿ۙ۱۴﴾﴾ ''اور مَیں نے اُس کے لیے ہر قسم کا سامان خوب اچھی طرح سے تیار کر دیا۔''

آیت ۱۵ ﴿ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ﴿٭ۙ۱۵﴾﴾ ''پھر وہ چاہتا ہے کہ مَیں اُسے اور بھی دوں!''

آیت ۱۶ ﴿کَلَّا ؕ﴾ ''ہرگز نہیں!''

﴿اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ﴿ؕ۱۶﴾﴾ ''وہ تو ہماری آیات کا مخالف (اور دشمن بن گیا) ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا ﴿ؕ۱۷﴾﴾ ''مَیں اسے عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھواؤں گا۔''

اس سے مراد ایسا عذاب ہے جس کی شدت ہر آن بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی نوعیت کے عذاب کا ذکر سورۃ الجن میں بھی آ چکا ہے: ﴿یَسۡلُکۡہُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾﴾ ''تو وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں۔''

ولید بن مغیرہ بنیادی طور پر بہت ذہین اور سمجھدار شخص تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' لیکن اپنے ضمیر کی اس آواز پر لبیک کہہ کر وہ اپنی چودھراہٹ اور دُنیوی ٹھاٹھ باٹھ کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ واقعتاً بہت مشکل میں تھا۔ اپنی اس مشکل کا حل اسے کسی درمیانی راہ میں نظر آتا تھا۔ چنانچہ قریش میں سب سے بڑھ کر اس شخص نے حضورﷺ پر سمجھوتے (compromise) کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے اس نے حضورﷺ کو ہمدردانہ انداز میں بھی سمجھایا' پُرکشش پیشکش کا حربہ بھی آزمایا اور برادری کے معاملات کا واسطہ بھی دیا کہ قریش اگر آپس میں تقسیم ہو جائیں گے تو ان کی بنی بنائی ساکھ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ غرض اس نے ہر طرح سے کوشش کی کہ حضورﷺ کچھ اپنی بات منوالیں' کچھ قریش کی مان لیں اور اس طرح فریقین کے اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے ختم کر دیا جائے۔

آئندہ آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالے سے اس شخص کی ایک خاص کیفیت کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ تفاسیر میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک محفل میں قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ زیر بحث موضوع یہ تھا کہ محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ایک متفقہ موقف اپنانا چاہیے۔ جب ہم میں سے کوئی اسے شاعر سمجھتا ہے' کوئی جادوگر کہتا ہے' کوئی کاہن قرار دیتا ہے تو اس سے خود ہمارا موقف کمزور ہو جاتا ہے کہ ہم خود کسی بات پر متفق نہیں۔ بحث مباحثے کے بعد انہوں نے ولید بن مغیرہ کو حضورﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ جائے اور آپؐ سے تفصیلی بات چیت کر کے انہیں اپنی حتمی رائے سے آگاہ کرے۔ جب وہ حضورﷺ سے ملاقات کر کے واپس آیا تو انہوں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ دراصل حضورﷺ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ آپؐ واقعی اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو کلام آپؐ پیش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ لیکن یہ بات سردارانِ قریش کے سامنے تسلیم کرنا اُسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا

ہے؟ کیا ہم محمد (ﷺ) کو محض ایک شاعر سمجھیں؟ تو اُس نے کہا: نہیں اُن (ﷺ) کا کلام شعر نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا تو کیا پھر ہم اُسے (ﷺ) کاہن کہہ سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: نہیں' کاہنوں کے قول و کردار کو مَیں خوب جانتا ہوں۔ وہ ذومعنی باتیں کرتے ہیں جبکہ یہ (ﷺ) تو دوٹوک اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس پر سردارانِ قریش نے کہا کہ لو جی! یہ تو گیا! اس پر بھی محمد (ﷺ) کا جادو چل گیا! اب اس نے اہلِ محفل کے جو تیور دیکھے تو فوراً پینترا بدل کر بولا کہ ہاں اس کے کلام کے بارے میں آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جادو ہے' جو پچھلے زمانے سے چلا آرہا ہے۔

اب ظاہر ہے ولید بن مغیرہ جیسے معتبر اور مدبّر شخص کا ایک بات پر پوری طرح سے قائل ہونے کے بعد زبان سے اس کی علی الاعلان نفی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے' زبان سے جھوٹ کہتے ہوئے اور اس دوران اپنی پریشانی اور خفت کو چھپاتے ہوئے جس کرب سے گزرا ہے' ان آیات میں اس کی اس پوری کیفیت کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کا یہ مقام فصاحت و بلاغت کی معراج اور لفظی منظر کشی کی بہترین مثال ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸﴾ ''اُس نے غور کیا اور کچھ اندازہ کیا۔''

اس نے سوچا کہ دل کی بات زبان پر لانے یعنی حق کو مان لینے سے کیا ہوگا اور نہ ماننے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ پھر جب اسے اپنے دُنیوی مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے تو اس نے ضمیر کی آواز کو دبا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

آیت ۱۹ ﴿فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹﴾ ''پس ہلاک ہو جائے' اُس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

اس کے اندازے کے مطابق تو حق کو مان لینے میں سراسر نقصان ہی نقصان تھا' لیکن اسے اس حقیقت کا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے حق کو حق سمجھتے ہوئے ماننے سے انکار کر کے کتنے بڑے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔

آیت ۲۰ ﴿ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰﴾ ''پھر ہلاک ہو جائے' اس نے کیسا غلط اندازہ ٹھہرایا۔''

آیت ۲۱ ﴿ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾﴾ ''پھر اُس نے دیکھا۔''

یعنی کچھ دیر توقف کیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

آیت ۲۲ ﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾﴾ ''پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔''

آیت ۲۳ ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾﴾ ''پھر اُس نے کہا کہ یہ تو بس جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾﴾ ''یہ نہیں ہے مگر انسان کا کلام۔''

یعنی اس کلام میں جادو کا سا اثر تو ہے' لیکن محمد (ﷺ) کا یہ دعویٰ کہ یہ اللہ کا کلام ہے اسے مَیں نہیں مانتا۔ مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی کلام ہی ہے —— اب اگلی آیات کو پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے حق کو پہچانتے ہوئے جھٹلا کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے دی۔

آیت ۲۶ ﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾﴾ ''میں عنقریب اسے ڈالوں گا سقر (دوزخ) میں!''

آیت ۲۷ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سقر کیا ہے؟''

آیت ۲۸ ﴿لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾﴾ ''وہ نہ تو باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی!''

آیت ۲۹ ﴿لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾﴾ ''انسان کی کھال کو جھلسا ڈالنے والی۔''

نہ تو اس کا عذاب ختم ہوگا اور نہ ہی اس میں جلتے ہوئے انسان کو موت آئے گی۔

آیت ۳۰ ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾﴾ ''اس پر انیس (۱۹) داروغے مقرر ہیں۔''

آغازِ سورت سے یہاں تک پورا کلام ایک ہی اسلوب میں ہے' یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔ لیکن اب آگے ایک طویل آیت آ رہی ہے۔ ایسی ہی ایک طویل آیت ہم سورۃ المزمل میں بھی پڑھ آئے ہیں' بلکہ سورۃ المزمل کا دوسرا رکوع اسی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ جس طرح سورۃ المزمل کی مذکورہ آیت باقی سورت سے الگ بعد میں نازل ہوئی' اسی طرح اس سورت کی یہ ایک آیت بھی بعد میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں دراصل مشرکین کی ان استہزائیہ باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ جہنم کے داروغوں کی تعداد کے بارے میں کرتے تھے۔ روایات

میں آتا ہے کہ جہنّم کے داروغوں کی تعداد کے معاملے کو انہوں نے مذاق بنالیا تھا اور وہ اپنی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے اس بارے میں طرح طرح کے فقرے کستے رہتے تھے۔ ایک محفل میں ابوجہل نے کہا تھا: بھائیو! تم نے سن لیا' اس نبی کے خدا کی فوج صرف انیس سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس دس آدمی مل کر بھی ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟ اس پر بنی جُمح کا ایک زورآور پہلوان یوں گویا ہوا کہ ان میں سے سترہ کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا' باقی دو سے تم سب مل کر نمٹ لینا۔ غرض وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اس آیت میں ان کی ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے:

آیت ۳۱ ﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪﴾ ''اور ہم نے نہیں مقرر کیے جہنّم کے داروغے مگر فرشتے''

ان لوگوں کو فرشتوں کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ فرشتوں کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا ان کی حماقت ہے۔

﴿وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ﴾ ''اور ہم نے نہیں ٹھہرائی ان کی یہ تعداد مگر کافروں کی آزمائش کے لیے''

﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''تاکہ جنہیں کتاب دی گئی تھی انہیں یقین آجائے''

جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق جہنّم کے اُنیس داروغوں کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اب ظاہر ہے اہلِ کتاب کے لیے تو قرآن کے حق میں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا﴾ ''اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ ایمان میں بڑھیں''

اہلِ ایمان کے لیے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر وحی ایمان میں اضافے کا باعث ہی بنتی ہے۔

﴿وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴾ ''اور نہ شک میں پڑیں اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان''

﴿وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

مَثَلًا ؕ﴾ ’’اور تاکہ کہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور کُفّار بھی کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے؟‘‘

یعنی منافقین اور کُفّار اپنے مَن پسند تبصرے کرتے رہیں کہ جہنّم کے فرشتوں کی تعداد بتانے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ’’اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔‘‘

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ ’’اور کوئی نہیں جانتا آپ کے ربّ کے لشکروں کو سوائے اُس کے۔‘‘

﴿وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾﴾ ’’اور یہ آیات صرف انسانوں کی یاددہانی کے لیے ہیں۔‘‘

اس کے بعد سورت کے آخر تک تمام آیات کا اسلوب اور آہنگ وہی ہے جو شروع سورت سے چلا آرہا ہے۔ یعنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز ردھم۔

آیات ۳۲ تا ۵۶

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا
لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۙ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۙ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ
يَتَاَخَّرَ ؕ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۙ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ
الْيَمِيْنِ ۛ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ
فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ
الْمِسْكِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ﴿۴۶﴾ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ؕ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ
الشّٰفِعِيْنَ ؕ﴿۴۸﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۙ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ
مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ؕ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ

اَنۡ یُّؤۡتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَۃً ﴿ۙ۵۲﴾ کَلَّا ؕ بَلۡ لَّا یَخَافُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ ﴿ؕ۵۳﴾ کَلَّاۤ
اِنَّہٗ تَذۡکِرَۃٌ ﴿ۚ۵۴﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿ؕ۵۵﴾ وَ مَا یَذۡکُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ
یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ ہُوَ اَہۡلُ التَّقۡوٰی وَ اَہۡلُ الۡمَغۡفِرَۃِ ﴿۵۶﴾

آیت ۳۲ ﴿کَلَّا وَ الۡقَمَرِ ﴿ۙ۳۲﴾﴾ ’’کیوں نہیں‘ قسم ہے چاند کی۔‘‘

آیت ۳۳ ﴿وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿ۙ۳۳﴾﴾ ’’اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔‘‘

یعنی جب رات رخصت ہو رہی ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَ الصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿ۙ۳۴﴾﴾ ’’اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے۔‘‘

یہاں چاند کی قسم اور پھر رخصت ہوتی ہوئی رات اور روشن صبح کے ذکر کے پردے میں بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ رات کی قسم میں فترتِ وحی کے طویل دور کی طرف اشارہ ہے‘ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوتِ محمدیؐ کے ظہور تک چھ سو برس پر محیط وہ عرصہ جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس دوران دنیا میں بلاشبہ جہالت کی تاریکی کا راج تھا۔ سابقہ نبوتوں کی تعلیمات زیادہ تر مسخ ہو چکی تھیں اور مجموعی طور پر دنیا کے اندر ہدایتِ آسمانی کی روشنی بہت مدھم پڑ چکی تھی۔ چاند کی قسم اسی مدھم اور مستعار روشنی کا اشارہ دے رہی ہے‘ جبکہ صبح کی روشنی نبوت و رسالتِ محمدیؐ کا استعارہ ہے۔ گویا علامات کے پردے میں ان تین آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلے چھ سو برس سے دنیا پر جہالت و ضلالت کی تاریک رات مسلط تھی‘ ہدایتِ خداوندی کی روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی‘ مگر اب رسالتِ محمدیؐ کا خورشید طلوع ہونے سے تاریکی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ان تین قسموں کا حوالہ سورۃ الانشقاق (پارہ تیس) کی آیات ۱۶ تا ۱۹ کے مطالعہ کے دوران دوبارہ آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿اِنَّہَا لَاِحۡدَی الۡکُبَرِ ﴿ۙ۳۵﴾﴾ ’’یقیناً یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک بات ہے۔‘‘

ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا واقعہ اور کون سا ہوگا۔

آیت ۳۶ ﴿نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿ۙ۳۶﴾﴾ ’’خبردار کرنے کے لیے انسانوں کو۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ یَّتَقَدَّمَ اَوۡ یَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾﴾ ''جو بھی تم میں سے چاہے کہ وہ آگے بڑھے یا پیچھے رہ جائے۔''

اب کامیابی کا دارومدار ہر کسی کی ہمت اور کوشش پر ہے۔ جس کی ہمت جوان ہو وہ سب سے آگے بڑھ کر صدیقیت کا مقام اور ''السابقون الاوّلون'' کا درجہ حاصل کر لے۔ جو کوئی دوسروں کا انتظار کر کے ذرا دیر سے چلنے میں عافیت سمجھے وہ وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لے اور جس کسی کی ہمت اور قسمت ساتھ نہ دے وہ خود کو مستقل طور پر محروم کر لے۔

آیت ۳۸ ﴿كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ ﴿۳۸﴾﴾ ''ہر جان رہن ہے اُس کے عوض جو کچھ کہ اُس نے کمایا ہے۔''

ہر انسان نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو کچھ کمایا ہے قیامت کے دن وہ سب کچھ اسے وصول کرنا ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡيَمِيۡنِ ﴿۳۹﴾﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو داہنے والے ہوں گے۔''

یعنی جن کا نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿فِيۡ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''وہ جنتوں میں ہوں گے' پوچھتے ہوں گے۔''

آیت ۴۱ ﴿عَنِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''گنہگاروں کے بارے میں۔''

آیت ۴۲ ﴿مَا سَلَكَكُمۡ فِيۡ سَقَرَ ﴿۴۲﴾﴾ ''تم لوگوں کو کس چیز نے جہنّم میں ڈالا؟''

آیت ۴۳ ﴿قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔''

آیت ۴۴ ﴿وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔''

آیت ۴۵ ﴿وَكُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِيۡنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور ہم کٹ حجتیاں کرنے والوں کے ساتھ مل کر کٹ حجتیاں کیا کرتے تھے۔''

ہم تو دنیا میں بس کھیل تماشوں میں ہی لگے رہے۔ حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے

ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے۔ ہم نے اپنی زندگی کے مقصد اور انجام کے بارے میں تو کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔

آیت ۴۶ ﴿وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾﴾ ”اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ہم جزاء وسزا کے دن کا انکار کرتے رہے۔“

آیت ۴۷ ﴿حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾﴾ ”یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا۔“

آیت ۴۸ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾﴾ ”تو اب ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوگی شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت۔“

آیت ۴۹ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾﴾ ”تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس یاددہانی (قرآن) سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں؟“

آیت ۵۰ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾﴾ ”گویا وہ بدکے ہوئے جنگلی گدھے ہیں۔“

آیت ۵۱ ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾﴾ ”جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔“

یہ لوگ ایک اللہ، قرآن اور آخرت کے ذکر سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر کی آہٹ پا کر جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں۔ ایسے مناظر اب ٹیلی ویژن پر عام دکھائے جاتے ہیں کہ افریقہ کے جنگلوں میں زیبروں کے غول کے غول شیر کی آہٹ محسوس کر کے بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾﴾ ”بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو پکڑا دیے جائیں کھلے صحیفے۔“

یہ ان کی استہزائیہ گفتگو کا ذکر ہے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت کے جواب میں اکثر ایسی باتیں کرتے تھے کہ یہ حساب کتاب کا معاملہ قیامت پر کیوں ٹالا جا رہا ہے؟ آپؐ اپنے اللہ سے کہیں کہ وہ مہربانی فرما کر ہمارے اعمالنامے ابھی ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کو اللہ کا کلام تب مانیں گے جب ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایک صحیفہ پکڑا دیا جائے گا۔

آیت ۵۳ ﴿كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾﴾ ”ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ وہ

آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔‘‘

جب ان کے دلوں میں آخرت کا خوف نہیں رہا تو اب وہ جیسی چاہیں باتیں بنائیں۔ فارسی کا مشہور محاورہ ہے: ’’بے حیا باش وہر چہ خواہی کن!‘‘ کہ ایک دفعہ حیا کا پردہ اٹھادو پھر جو چاہو کرو۔ چنانچہ آخرت سے بے خوف ہو کر وہ ہر طرح کی باتیں بنانے میں آزاد ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝۵۴﴾ ’’ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک یاددہانی ہے۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۵۵﴾ ’’اب جو چاہے اس سے نصیحت اخذ کر لے۔‘‘

آیت ۵۶ ﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ ’’اور یہ لوگ نصیحت اخذ نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔‘‘

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۵۶﴾ ’’وہی ڈرنے کے لائق ہے اور وہی مغفرت کا مجاز۔‘‘

یہ اُسی کا حق ہے کہ اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے‘ اُس کے احکام کی پاسداری کی جائے اور وہی اس کا اہل ہے کہ جس کی چاہے مغفرت فرما دے۔ ❀❀❀

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو رویڈیو کیسٹس رسی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ہجری سالِ نو مبارک

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ (۳۰/اکتوبر ۱۹۸۱ء) کے خطابِ جمعہ سے ماخوذ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ... بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیْ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ :

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾﴾

وَقَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ سُوْرَۃِ آلِ عِمْرَانَ:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ﴿۱۶۹﴾﴾

اَمَّا بَعْدُ : رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْO وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْO وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْO یَفْقَهُوْا قَوْلِیْO

اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ .....

اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ... آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

آج پندرہویں صدی ہجری کے دوسرے سال کا پہلا دن ہے۔لہٰذا سب سے پہلے تو میں اسلامی تقویم کے اعتبار سے اس نئے سال کی آمد پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سال ہمارے لیے امن و امان اور سلامتی و

اسلام کا سال ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے آغاز میں وہ دعا پڑھی ہے جو نبی کریم ﷺ ہر ماہ نئے چاند کے طلوع ہونے پر پڑھا کرتے تھے‘ یعنی ((اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ)) جس کے آخر میں آنحضرت ﷺ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ''رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ۔ ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ'' چنانچہ اس دعا کے تین حصے ہیں۔ اصل دعا تو پہلا حصّہ ہے کہ ''اے اللہ! اس چاند کو ہم پر امن وایمان اور سلامتی واسلام کے ساتھ طلوع فرما''۔ دوسرے حصے میں چاند سے خطاب ہے۔ اس میں دراصل مشرکانہ اوہام اور عقائد کی نفی اور ابطال ہے جو چاند‘ سورج اور اجرامِ فلکیہ کے بارے میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے: رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ یعنی ''میرا رب بھی اللہ ہے اور اے چاند تیرا رب بھی اللہ ہے''۔ تیسرا حصّہ ایک نوید اور خوشخبری بھی ہے اور اس میں ایک دعائیہ پہلو بھی ہے: ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ یعنی یہ ہلال جو طلوع ہوا ہے یہ رُشد اور خیر کا ہلال ہے۔ یہاں ''ہے'' بھی ترجمہ ہوسکتا ہے اور ''ہو'' بھی ہوسکتا ہے۔ اوّل الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ نوید وخوشخبری ہے اور اگر مؤخر الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ دعا ایک تمنّا اور خواہش کا اظہار ہے۔

اس نئے چاند سے صرف ایک نیا مہینہ ہی شروع نہیں ہوا بلکہ نیا اسلامی وہجری سال بھی شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ! اس سال کو نوعِ انسانی کے حق میں بالعموم‘ مسلمانانِ عالَم کے حق میں بالخصوص اور اس خطۂ ارضی کے حق میں‘ جو تُو نے اسلام کے نام پر ہمیں عطا فرمایا تھا اور جو مملکتِ خداداد پاکستان کہلاتا ہے‘ خاص الخاص طریق پر اپنے فضل اور اپنی رحمت سے امن وسلامتی کا سال بنا اور اس سال میں ہمارے ایمان اور اسلام میں حقیقی رنگ پیدا فرما۔ مَیں نے مزید یہ دعا بھی کی ہے کہ اس سال کے دوران تیرے علم کامل میں جن کی وفات کا وقت قریب آ رہا ہو‘ اے اللہ ان کو ایمان پر وفات دیجیو اور جن کے لیے تیرے علم ازلی میں مزید مہلتِ عمر طے ہو ان کو اسلام پر قائم رکھیو — ((اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ ، وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ))

اس موقع پر ایک جملہ معترضہ کے طور پر مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ محرم الحرام کے مہینے کو ہم نے ایک مخصوص مکتب فکر کے زیر اثر بلاسبب اور قطعی نامناسب طور پر رنج وغم اور حزن والم کا مہینہ بنالیا ہے' حالانکہ کسی بھی اعتبار سے یہ مہینہ ہمارے لیے رنج وغم کا مہینہ نہیں ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سال کا کوئی مہینہ بھی دینی لحاظ سے رنج وغم کا مہینہ نہیں ہے۔ یومِ عاشوراء (۱۰ محرم الحرام) کی جو اہمیت ہمارے ہاں ہے' اس میں ہمارے دینی تصورات وعقائد کے لحاظ سے عظمت کا پہلو ہے۔ اس ضمن میں بہت سی احادیث صحیحہ کتبِ احادیث میں موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اس دن جو روزہ رکھتے تھے تو اس کی کوئی بنیاد اور تعلق حادثہ کربلا سے نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو نبی اکرم ﷺ کی الرفیق الاعلیٰ کی جانب مراجعت کے نصف صدی سے بھی زائد بعد پیش آیا ہے۔ لہٰذا دینی لحاظ سے اس حادثے کا یومِ عاشوراء سے کسی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

صومِ عاشوراء کے متعلق ایک متفق علیہ حدیث ملتی ہے یعنی سند کے اعتبار سے جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین اتفاق کر رہے ہوں اور جس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ' جو آنحضرت ﷺ اور حضرت علی ؓ دونوں کے چچازاد بھائی ہیں اور جو گویا حضرات حسنین ؓ کے رشتے کے چچا بھی ہیں اور نانا بھی۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپؐ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود ۱۰ محرم الحرام کو روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ''تم یہ روزہ کیوں رکھتے ہو؟'' انہوں نے بتایا کہ ''یہ دن ہمارے لیے بڑی خوشی کا دن ہے' اس لیے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو آلِ فرعون کے ظلم واستبداد سے نجات دلائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو' جو تعاقب میں تھا' غرق کیا تھا' لہٰذا ہم شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھتے ہیں''۔ اس پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تمہاری نسبت (حضرت) موسیٰؑ کے ہم زیادہ حق دار ہیں''۔ یہود نے تو اس کو ایک قومی دن کا درجہ دے رکھا ہے' حالانکہ یہ دن دین اسلام کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور دین اسلام کی تاریخ تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ اسی موقع پر آنحضور ﷺ

نے فرمایا کہ ''ہم اس دن کا روزہ رکھنے کے زیادہ حق دار ہیں''۔ چنانچہ اس وقت سے آنجناب ﷺ نے دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا شروع فرما دیا۔

ویسے بھی اس بات کو اچھی طرح جان لیجیے کہ ہمارے دین میں ''شہادت'' کا معاملہ کوئی رنج وغم والی بات ہے ہی نہیں' بلکہ یہ تو ایک مردِ مؤمن کے لیے فوز ومرام اور فلاح و کامرانی کا بلند ترین اور ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ دلیل کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیت: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾ یعنی ''جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں مردہ نہ کہو' بلکہ یہ لوگ (تو حقیقت میں) زندہ ہیں مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں۔'' اور سورۂ آلِ عمران کی آیت: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾ یعنی ''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو' بلکہ وہ زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس سے روزی پا رہے ہیں'' کو پیش نظر رکھیے۔ ان مقتولین کی برزخی زندگی میں حیات اور اس میں رزق پانے کی کیفیات امورِ غیب سے متعلق ہیں لہٰذا اس کا کوئی تصور و شعور اس عالمِ ناسوت میں ہمارے لیے ممکن نہیں۔

شہادت فی سبیل اللہ وہ سعادتِ عظمیٰ اور چوٹی کا وہ عمل ہے کہ جس کے لیے انبیاء و رسل علیہم السلام تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں آنحضرت ﷺ کی دو دعائیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ))

''اے اللہ! مَیں تجھ سے تیری راہ میں شہادت کا سوال کرتا ہوں۔''

اور دوسری یہ کہ: ((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ))

''اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت (کی موت) نصیب فرما۔''

مزید برآں آنحضور ﷺ کا یہ قول بھی احادیث میں منقول ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ ، ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ)) (متفق علیه)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا

جاؤں‘ پھر مجھے زندہ کیا جائے‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت رہی ہے کہ رسول قتل نہیں ہوتے‘ اس لیے کہ اس طرح عالمِ ظاہری میں رسول کی مغلوبیت کا پہلو نکلتا ہے‘ لیکن اس حدیث سے مرتبۂ شہادت کے رفیع و مہتم بالشان ہونے کا اندازہ لگا لیجیے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی بھی ملاحظہ کیجیے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ)) (رواہ مسلم و ابوداؤد)

’’جس مسلمان کی موت اس حال میں آئی کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں راہِ حق میں سر کٹا کر سرخرو ہونے کی تمنا و آرزو پیدا ہوئی‘ اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوئی۔‘‘

پس شہادت ہرگز رنج و الم‘ سوگ اور ماتم کرنے والی چیز نہیں ہے۔

اگر شہادت رنج و غم اور الم و ماتم والی شے ہوتی تو دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی عظیم شہادت وقوع پزیر نہ ہوئی ہو۔ اگر شہادت میں رنج و غم اور ماتم کا پہلو تلاش کریں تو حضرت سُمیہ ؓ کی شہادت کا دن بھی ماتم کے دن کے طور پر منانا ہوگا۔ یہ بڑی عظیم شہادت ہے۔ توحید کے لیے یہ پہلا خون بہا ہے جس سے مکہ مکرمہ کی زمین لالہ زار ہوئی اور کس بہیمانہ طریقے پر کہ ابوجہل نے تاک کر اندامِ نہانی پر نیزہ مارا جو پشت کے پار ہو گیا۔ پھر ان کے شوہر حضرت یاسر ؓ کی عظیم شہادت ہے جس کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل اور اس کے شقی القلب ساتھیوں نے حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیوں سے باندھے‘ پھر چہار سمت میں چار اونٹ کھڑے کر کے یہ رسیاں اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ کر ان کو ہانک دیا گیا‘ یوں حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ شوہر اور بیوی محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے جرم میں اس ظالمانہ طور پر شہید کیے گئے۔ ان کی مظلومانہ شہادت کے واقعات ایک حساس دل انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر ہمیں سوگ اور ماتم کا دن منانا ہوتا تو ان کا مناتے!

پھر اگر نبی اکرم ﷺ سے قرابت کی بنیاد پر شہادت کا دن نوحہ وگریہ اور ماتم کا کوئی پہلو رکھتا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن اس کا کہیں زیادہ مستحق ہوتا کہ اسے سوگ کا دن منایا جائے‘ جن کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ قرابت داری کے تہرے بلکہ چوہرے رشتے ہیں۔ چنانچہ چچا بھتیجے کا رشتہ بھی ہے‘ خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور رضاعی بھائی بھی ہیں۔ عرب میں رضاعت کا رشتہ بالکل خونی رشتے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسلام میں نکاح کی حرمت جس طرح رحم اور خون کے رشتوں کی بنیاد پر ہے اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر بھی ہے۔ پھر ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں۔ مزید اضافہ کیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ مبارک کے مطابق ”اَسَدُ اللّٰہِ“ بھی ہیں اور ”اَسَدُ رَسُوْلِہٖ“ بھی۔ پھر نعش مبارک کا حال یہ ہے کہ اعضاء بریدہ (مُثلہ شدہ) ہیں‘ شکم چاک ہے‘ کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگر ہر سال سوگ کا دن منایا جاتا اور ماتم کیا جاتا تو ان کی شہادت پر کیا جاتا۔ پھر یہ کہ حضرت زید بن حارثہ‘ حضرت جعفر طیار بن ابی طالب‘ حضرت عبداللہ بن رواحہ‘ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم اور بے شمار دوسرے جاں نثارانِ محمد ﷺ دورِ نبوت میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ سوگ کا دن منایا جاتا تو ان کا منایا جاتا۔ لیکن رنج وغم کی بات کون سی ہے! اسلام کی تاریخ کا کون سا دور ہے جو ان شہادتوں اور قربانیوں سے خالی ہو؟ اسلام کے گلشن میں ہر چہار طرف یہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔

پھر غور فرمایئے کہ اسلامی تقویم کا جو پہلا دن ہر سال آتا ہے‘ یعنی یکم محرم الحرام تو یہ ایک عظیم شہادت یعنی دوسرے خلیفہ راشد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن ہے۔ وہ عمرؓ جن کے متعلق آنحضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے“۔ اگر رنج وغم کے اظہار کا مسئلہ ہوتا اور سوگ کا دن منانے کا معاملہ ہوتا تو آج کے دن یعنی یکم محرم الحرام ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ۲۸ ر ذی الحجہ کو ہوا تھا جس میں آنجناب مجروح ہوئے تھے اور معتبر روایات کے مطابق ان کی وفات یکم محرم الحرام کو ہوئی تھی۔ پھر ۱۸ ر ذی الحجہ کو تیسرے خلیفہ راشد ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد انتہائی مظلومانہ طور پر شہید کیے گئے

'جن کی شہادت کے نتیجے میں مسلمان آپس میں دست وگریباں ہوئے اور اُمّت میں ایسا تفرقہ پڑا کہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو اس ''شہیدِ مظلوم'' کی شہادت کے دن کو منایا جاتا۔ پھر ۲۱؍رمضان المبارک کو اسد اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی' آپؐ کے داماد' چوتھے خلیفہ راشد شہید کر دیے گئے جو حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کے والد ماجد بھی ہیں۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو ایک مخصوص مکتبِ فکر کے افراد کے بجائے پوری اُمّت آنجناب کی شہادت کے دن سوگ مناتی۔

اگر سوگ کے دن منانے کا سلسلہ جاری رہے تو بتایئے کون کون سے دن سوگ منایا جائے گا؟ سال کا کون سا دن ہوگا جو کسی نہ کسی عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کی شہادت یا وفات کا دن نہ ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین میں سوگ اور ماتم اور ان کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جس گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہو تو سوگ کی کیفیت کی زیادہ سے زیادہ تین دن کے لیے اجازت ہے۔ اس میں بھی نوحہ' گریہ اور سینہ کوبی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان میں سے جنہوں نے بھی اللہ کی راہ میں قربانیاں دی ہیں اور حق وصداقت کے لیے اپنی جانیں دی ہیں' اس کی بنیاد پر ان کا بہت ارفع واعلیٰ مقام ہے۔ لیکن نہ تو دن اور یادگار منانا ہمارے دین کے مطابق ہے' نہ ہی یہ کوئی رنج وغم اور اَلم وحزن کا معاملہ ہے اور نہ ہر سال سوگ اور ماتم کرنا دین سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

ہمارے یہاں صوفیاء کے نزدیک موت کو محبوب اور محب کی ملاقات کا وقت تصوّر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ جو لفظ ''عرس'' رائج ہے تو اس کے معنی شادی کے ہیں۔ جیسے عرس (شادی) ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے ویسے ہی موت ایک مردِ مؤمن کے لیے کسی رنج وغم کا موقع ہے ہی نہیں' چاہے وہ طبعی ہو چاہے قتل کی صورت میں۔ یہ تو درحقیقت محبوب اور محب کی ایک ملاقات ہے۔ اس پہلو سے علّامہ اقبال کا یہ شعر ذہن میں رکھیے کہ ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست!

تو تبسّم خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔ پس یہ سوگ اور ماتم کے دن منانا ہمارے دین کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز قطعاً نہیں ہے۔ ❁❁❁

کربلا کی کہانی

حضرت ابوجعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی

ترجمہ: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ؒ

روایت کے راوی عمار دہنی نے کہا کہ مَیں نے محمد بن علی بن الحسین ؒ سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے واقعہ قتل حسین ؓ ایسے انداز سے بیان فرمائیں کہ گویا مَیں خود وہاں موجود تھا اور یہ سامنے ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت ان کا بھتیجا‘ یزید کا چچیرا بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ ولید نے حسبِ دستور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تاکہ ان سے نئے امیر یزید کے لیے بیعت لیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ سردست آپ سوچنے کی مہلت دیں اور اس بارے میں نرمی اختیار کریں۔ ولید نے ان کو مہلت دے دی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مہلت پا کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء جب کوفہ والوں کو اس کا پتہ چلا کہ حضرت ؓ تو مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے اپنے قاصد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں‘ ہم اب آپ ہی کے ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ یزید کی بیعت سے منحرف ہیں۔ ہم نے گورنر کوفہ کے پیچھے جمعہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اُس وقت حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ یزید کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب اہلِ کوفہ کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں آئیں تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تاکہ وہ وہاں جا کر صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ اگر اہلِ کوفہ کے بیانات صحیح ہوئے تو خود بھی کوفہ پہنچ جائیں گے۔

حضرت مسلم ؓ کی کوفہ روانگی

قرارداد کے مطابق حضرت مسلم ؓ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے‘ وہاں سے راستہ کی

راہنمائی کے لیے دو آدمی ساتھ لیے اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس راستہ سے وہ لے گئے اس میں ایک ایسا لق ودق میدان آ گیا جس میں پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے سخت دوچار ہو گئے۔ چنانچہ اسی جگہ ایک رہنما انتقال کر گیا۔ اس صورتِ حال کے پیش آنے پر حضرت مسلمؒ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر کوفہ جانے سے معذرت چاہی لیکن حضرت ممدوحؓ نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ ضرور کوفہ جائیں۔ بنابریں حضرت مسلمؒ کوفہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص عوسجہ نامی کے گھر قیام فرمایا۔ جب اہلِ کوفہ میں حضرت مسلمؒ کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو وہ خفیہ طور پر ان کے ہاں آئے اور ان کے ہاتھ پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ بارہ ہزار اشخاص نے بیعت کر لی۔

دریں اثنا یزید کے ایک کارندہ عبداللہ بن مسلم بن شعبہ حضرمی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ساری کارروائی کی اطلاع گورنرِ کوفہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو دے دی اور ساتھ ہی کہا کہ یا تو آپ واقعتاً کمزور ہیں یا کوفہ والوں نے آپ کو کمزور سمجھ رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ شہر کی صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے! اس پر حضرت نعمانؓ نے فرمایا کہ میری ایسی کمزوری جو بربنائے اطاعتِ الٰہی ہو وہ مجھے اُس قوت وطاقت سے زیادہ پسند ہے جو اُس کی معصیت میں ہو۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جس امر پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالے رکھا ہے خواہ مخواہ اس پردہ کو فاش کروں۔ اس پر عبداللہ مذکور نے یہ سارا ماجرا یزید کو لکھ کر بھیج دیا۔ یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سرحون نامی سے اس بارے میں مشورہ لیا۔ اُس نے کہا ''اگر آپ کے والد زندہ ہوتے اور آپ کو کوئی مشورہ دیتے تو اسے قبول کرتے؟'' یزید نے کہا 'ضرور!' سرحون نے کہا 'تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوفہ کی گورنری عبیداللہ بن زیاد کے سپرد کر دیں۔ ادھر صورتِ حال ایسی تھی کہ ان دنوں یزید عبیداللہ مذکور پر ناراض تھا اور بصرہ کی گورنری سے بھی اسے معزول کرنا چاہتا تھا' مگر سرحون کے مشورے پر اس نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری پر بھی عبیداللہ بن زیاد کو نامزد کر دیا اور لکھ دیا کہ کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو تلاش کرو' اگر مل جائے تو اس کو قتل کر دو۔

ابنِ زیاد کوفہ میں اور اِفشائے راز

اس حکم کی بنا پر عبیداللہ بن زیاد بصرہ کے چند سرکردہ لوگوں کے ہمراہ اس حالت میں کوفہ پہنچا کہ اُس نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا تاکہ اُسے کوئی پہچان نہ سکے۔ وہ اہلِ کوفہ کی جس مجلس سے

گزرتا اُس پر سلام کرتا اور وہ حضرت حسین ؓ سمجھ کر وعلیکَ السَّلام یا ابنَ رَسُولِ اللّٰہِ ''اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے' آپ پر بھی سلام!'' سے جواب دیتے۔ اسی طرح سلام کہتا اور جواب لیتا ہوا وہ قصرِ امارت پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک غلام کو تین ہزار درہم دیے اور کہا کہ تم جا کر اس شخص کا پتہ لگاؤ جو کوفہ والوں سے بیعت لیتا ہے۔ لیکن دیکھو تم خود کو ''حمص'' کا باشندہ ظاہر کرنا اور یہ کہنا کہ میں بیعت کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ رقم بھی پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنے مشن کی تکمیل میں اس کو صرف کریں۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور بہ لطائف الحیل اس شخص تک اُس کی رسائی ہوگئی جو بیعت لینے کا اہتمام کرتا تھا۔ پھر اس نے اپنے آنے اور امدادی رقم پیش کرنے کی سب بات کہہ ڈالی۔ اُس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمہیں ہدایت کا راستہ نصیب ہوا' لیکن یہ محسوس کر کے دکھ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری اسکیم ابھی پختہ نہیں ہوئی۔ تاہم وہ اس غلام کو حضرت مسلم بن عقیلؒ کے ہاں لے گیا۔ حضرت مسلمؒ نے اس سے بیعت بھی لے لی اور رقم بھی اس سے قبول کر لی۔ اب وہ یہاں سے نکلا اور عبید اللہ بن زیاد کے پاس سیدھا پہنچا اور سب کچھ اس کو بتلا دیا۔ ادھر عبید اللہ کی کوفہ میں آمد کے بعد حضرت مسلم عوسجہ کا گھر چھوڑ کر ہانی بن عروہ مرادی کے مکان پر فروکش تھے اور حضرت حسین ؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ لوگوں نے بارہ ہزار کی تعداد میں ہماری بیعت کر لی ہے' آپ کوفہ تشریف لے آئیں۔

اور یہاں یہ ہوا کہ جب عبید اللہ کو پتہ چل گیا کہ حضرت مسلمؒ ہانی کے مکان پر ہیں تو اس نے کوفہ کے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ کیا بات ہے' ہانی میرے پاس نہیں آئے! اس پر حاضرین میں سے ایک شخص محمد بن اشعب چند ہمراہیوں کے ساتھ ہانی کے ہاں گئے تو وہ اپنے دروازے پر موجود تھے۔ ابن اشعب نے کہا کہ گورنر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں اور آپ کے اب تک نہ حاضر ہونے کو بہت محسوس کرتے ہیں' لہٰذا آپ کو چلنا چاہیے۔ چنانچہ ان کے زور دینے پر ہانی ان کے ساتھ ہو لیے اور وہ عبید اللہ کے پاس پہنچے۔ اتفاق سے اُس وقت قاضی شریح بھی ابن زیاد کے پاس موجود تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا: دیکھو اس ہانی کی چال کھوٹ کی مظہر ہے۔ پھر اتنے میں وہ اس کے پاس آ گیا تو کہا: ''ہانی! مسلم بن عقیل کہاں ہیں؟'' اُس نے کہا: ''مجھے علم نہیں!'' اس پر عبید اللہ نے تین ہزار درہم دینے والے غلام کو اس کے سامنے کر دیا۔ ہانی بالکل لاجواب ہو گئے' البتہ اتنا کہا کہ مَیں نے انہیں اپنے گھر بلایا نہیں بلکہ وہ خود

میرے گھر آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ ابن زیاد نے کہا: اچھا ان کو حاضر کرو۔ اس نے اس پر پس وپیش کیا تو ابن زیاد نے اس کو اپنے قریب بلوا کر اس زور سے چھڑی ماری جس سے اس کی بھنویں پھٹ گئیں۔ اس پر ہانی نے اس کے ایک محافظ سپاہی سے تلوار چھین کر عبید اللہ پر وار کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر ابن زیاد نے یہ کہہ کر کہ اب تمہارا خون حلال ہے' قصرِ امارت کے ایک حصے میں اس کو قید میں ڈال دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع ہانی کے قبیلہ مذحج کو ہوئی تو اس نے قصرِ امارت پر یلغار بول دی۔ عبید اللہ نے شور سنا اور پوچھا تو بتایا گیا کہ ہانی کا قبیلہ ان کو چھڑانے کے لیے آیا ہے۔ اس نے قاضی شریح کے ذریعہ ان کو کہلایا کہ ہانی کو مسلم بن عقیل کا پتہ کرنے اور بعض باتوں کی تحقیق کے لیے روک لیا گیا ہے' خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ساتھ ہی قاضی شریح پر بھی ایک غلام کو لگا دیا' یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں! قاضی شریح لوگوں کی طرف جاتے ہوئے ہانی کے پاس سے گزرے تو اس نے قاضی صاحب سے کہا کہ میرے بارے میں اللہ سے ڈرنا' ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ تاہم قاضی شریح نے ہجوم کو ابن زیاد والی بات کہہ کر مطمئن کر دیا' اور لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

حضرت مسلمؒ کو جب ہنگامہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ذرائع ابلاغ سے کوفہ میں اعلان کرا دیا' جس کے نتیجہ میں چالیس ہزار لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے ان کو باقاعدہ ایک فوجی دستہ کی شکل دے دی جس کا مقدمۃ الجیش' میمنہ اور میسرہ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ خود حضرت مسلم بن عقیل اس کے قلب میں ہو گئے۔ اس طرح چالیس ہزار کا یہ لشکر جرار قصرِ امارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبید اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے سردارانِ کوفہ کو اپنے قصر میں بلا لیا۔ جب یہ لشکر قصرِ امارت تک پہنچ گیا تو سردارانِ کوفہ نے اپنے اپنے قبیلے کو دیواروں کے اوپر سے گفتگو کر کے سمجھانا شروع کیا۔ اب تو حضرت مسلمؒ کی فوج کے آدمی کھسکنے شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے شام تک صرف پانچ سو رہ گئے' حتیٰ کہ رات کے اندھیرے تک وہ بھی چل دیے۔

جب حضرت مسلمؒ نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں ایک مکان کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خاتون اندر سے آپ کی طرف نکلی۔ آپ نے اُس کو پانی پلانے کے لیے کہا تو اس نے پانی تو پلا دیا لیکن اندر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر باہر

آئی تو آپ کو دروازے پر دیکھ کر اُس نے کہا: اے اللہ کے بندے! آپ کا اس طرح بیٹھنا مشکوک ہے' یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے کہا: مَیں مسلم بن عقیل ہوں' کیا تم مجھے پناہ دوگی؟ اُس نے کہا' ہاں آ جایئے۔ آپ اندر چلے گئے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس عورت کے لڑکے نے محمد بن اشعث مذکور کو اطلاع دے دی جس نے فوراً عبیداللہ تک خبر پہنچائی۔ اُس نے اس کے ہمراہ پولیس کو روانہ کر دیا اور ان کو حضرت مسلم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

پولیس نے جا کر مکان کا محاصرہ کر لیا جب کہ حضرت مسلم کو خبر تک نہ ہوسکی تھی۔ اب خود کو انہوں نے محصور پایا تو تلوار سونت کر نکل آئے اور پولیس سے مقابلے کی ٹھان لی' لیکن ابن اشعث نے ان کو روک کر کہا کہ مَیں ذمہ دار ہوں' آپ محفوظ رہیں گے۔ پس وہ حضرت مسلمؓ کو ابن زیاد کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ چنانچہ ابن زیاد کے حکم سے انہیں قصرِ امارت کی چھت پر لے جا کر قتل کر دیا گیا (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن) اور اُن کی لاش بازار میں لوگوں کے سامنے پھینک دی گئی۔ نیز اُس کے حکم سے ہانی کو کوڑے کرکٹ کی جگہ تک گھسیٹتے ہوئے لے جا کر سولی دے دی گئی۔ ادھر تو کوفہ میں یہ تک ہو گیا تھا اور......

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی

اُدھر حضرت مسلم چونکہ خط لکھ چکے تھے کہ بارہ ہزار اہل کوفہ نے بیعت کر لی ہے' حضرت حسینؓ جلد از جلد تشریف لے آئیں' اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکّہ شریف سے کوفہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ قادسیہ سے تین میل کے فاصلے پر حُر بن یزید تمیمی حضرت حسینؓ کے قافلہ کو ملا۔ اس نے کہا: کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: کوفہ۔ اس نے کہا کہ وہاں تو کسی خیر کی توقع نہیں' آپ کو یہاں سے ہی واپس ہو جانا چاہیے۔ پھر کوفیوں کی بے وفائی اور حضرت مسلم کے قتل کی پوری روداد آپ کو سنائی۔ سارا قصہ سن کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا' لیکن حضرت مسلمؓ کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا کہ ہم خونِ مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود مارے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے بغیر میں جی کر کیا کروں گا؟ اب وہ سب کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کو ابن زیاد کی فوج کا ہراول دستہ نظر آیا تو آپ نے ''کربلا'' کا رُخ کر لیا اور وہاں جا کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں ایک ہی طرف سے جنگ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ خیمے نصب کر لیے۔ اُس وقت آپ کے ساتھ پینتالیس

سوار اور سو کے قریب پیدل تھے۔

دریں اثناء عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو جو کوفہ کا گورنر تھا' بلایا اور اس سے کہا کہ اس شخص کے معاملے میں میری مدد کریں۔ اس نے کہا: مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ ابن زیاد نہ مانا۔ اس پر عمرو بن سعد نے کہا: پھر ایک شب سوچنے کی مہلت تو دے دیجیے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے' سوچ لو۔ ابن سعد نے رات بھر سوچنے کے بعد آمادگی کی اطلاع دے دی۔

اب عمرو بن سعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دیکھو تین باتوں میں سے ایک بات منظور کر لو: (۱) یا مجھے کسی اسلامی سرحد پر چلے جانے دو' (۲) یا مجھے موقع دو کہ میں براہِ راست یزید کے پاس پہنچ جاؤں (۳) یا پھر یہ کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

ابن سعد نے یہ تجویز خود منظور کر کے ابن زیاد کو بھیج دی۔ اس نے لکھا: ہمیں یہ منظور نہیں ہے' (بس ایک ہی بات ہے کہ) حسینؓ (یزید کے لیے) میری بیعت کریں۔ ابن سعد نے یہی بات حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچا دی۔ انہوں نے فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور حضرت کے سب ساتھی (مظلومانہ) شہید ہو گئے' جن میں دس سے کچھ اوپر نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ اسی اثناء میں ایک تیر آیا جو حضرت کے ایک چھوٹے بچے کو لگا جو گود میں تھا۔ آپ اس سے خون پونچھ رہے تھے اور فرما رہے تھے: ''اے اللہ! ہمارے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فیصلہ فرما جنہوں نے پہلے یہ لکھ کر ہمیں بلایا ہے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے' پھر اب وہی ہمیں قتل کر رہے ہیں''۔ اس کے بعد خود تلوار ہاتھ میں لی' مردانہ وار مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے! رضی اللہ عنہ۔ اور یہ شخص جس کے ہاتھ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے قبیلہ مذحج کا آدمی تھا' اگرچہ اس بارے میں دوسرے اقوال بھی کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں۔

مذحج ہانی کا وہی قبیلہ تھا جس نے قصرِ امارت پر چڑھائی کر دی تھی۔ یہ شخص حضرت کا سر تن سے جدا کر کے ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ اس نے ایک شخص کو آپ کا سر مبارک دے کر یزید کے پاس بھیج دیا' جہاں جا کر یزید کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ادھر ابن سعد بھی حضرت کے گھر دار کو لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا صرف ایک لڑکا بچا رہ گیا تھا اور وہ بچہ علی بن الحسینؓ زین العابدینؒ تھے' جو روایت کے راوی ابو جعفر الباقرؒ کے والد تھے۔ یہ عورتوں کے ساتھ اور

بیمار تھے۔ ابن زیاد نے حکم دیا: اس بچے کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس پر ان کی پھوپھی حضرت زینب بنت علیؓ اس کے اوپر گر پڑیں اور فرمایا کہ جب تک مَیں قتل نہ ہو جاؤں گی اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں ابن زیاد نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا اور بعد میں اسیرانِ جنگ کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

جب حضرت حسینؓ کے یہ بچے کھچے افرادِ خانہ یزید کے دربار میں پہنچے تو چند درباریوں نے حسبِ دستور یزید کو تہنیت فتح پیش کی۔ ان میں سے ایک شخص نے یہاں تک جسارت کر ڈالی کہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''امیر المومنین! یہ مجھے دے دیجیے''۔ یہ سن کر حضرت زینبؓ بنت علیؓ نے کہا: ''بخدا! یہ نہیں ہو سکتا' بجز اس صورت کے کہ یزید دینِ الٰہی سے نکل جائے''۔ پھر اس شخص نے دوبارہ کہا تو یزید نے اُسے ڈانٹ دیا۔

اس کے بعد یزید نے ان سب کو محل سرا میں بھیج دیا۔ پھر ان کو تیار کرا کے مدینہ روانہ کروا دیا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو خاندانِ عبدالمطلب کی ایک عورت سر پیٹتی اور روتی ہوئی ان سے ملنے کے لیے آئی اور اس کی زبان پر یہ اشعار تھے: ؎

ما ذا تقولون ان قال النبی لکم　　ما ذا فعلتم وانتم آخر الامم
بعترتی وباھلی بعد مفتقدی　　منھم اسارٰی وقتلٰی ضرجوا بدم
ما کان ھذا جزائی اذ نصحتُ لکم　　ان تخلفونی بشر فی ذوی رحمی

''تم کیا جواب دو گے اگر نبی مکرم ﷺ نے تم سے کہا کہ تم نے کون سا عمل کیا (میرے اہلِ بیت کے ساتھ) حالانکہ تم آخری اُمّت ہو! (تم نے کیا سلوک کیا) میری اولاد اور میرے خاندان والوں کے ساتھ میری وفات کے بعد! ان میں سے بعض قیدی ہیں اور بعض مقتولین ہیں' جو خون میں لت پت ہیں۔ مَیں نے تمہیں جو تذکیر و نصیحت کی' کیا اُس کا بدلہ یہ تھا کہ تم میرے خاندان کے ساتھ میرے بعد برا سلوک کرو!''

(اس روایت کو حافظ ابن حجر العسقلانی نے ''تہذیب التہذیب'' میں نقل کیا ہے۔)

سُنّتِ ابراہیمی اور فریضۂ قربانی

راحیل گوہر صدیقی ☆

کسی بھی دین کو الہامی مان لینے کے دو ہی دلائل تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے حسی اور عقلی پیمانے پر ناپا جائے اور دوسرے نقلی روایات اپنے تاریخی تسلسل کے ساتھ اس کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے احکام و فرامین اور حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اگر یہ دونوں اہم امور انسان کی فکر و عمل سے خارج ہیں تو وہ کوئی اور دین تو ہو سکتا ہے‘ دینِ الٰہی نہیں کہلا سکتا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ عزوجل نے قلبِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ سے نوازا تھا۔ آپؑ کی پوری زندگی ابتلا و آزمائش سے عبارت ہے۔ آپؑ کی حیاتِ طیبہ میں آزمائشوں اور امتحانات کا سورج نصف النہار پر رہا۔ قرآن حکیم نے اپنے اس بندے پر ڈالی ہوئی آزمائشوں کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۴)

’’اور جب ابراہیم کو اُس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو وہ ان پر پورا اترا۔‘‘

از روئے قرآن حکیم اس حیاتِ دُنیوی کی غرض وغایت ہی امتحان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

’’وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔‘‘

اس امر کی اہمیت کے پیشِ نظر ایک اور مقام پر یوں ارشاد ربانی ہوا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا ۢ بَصِیْرًا ②﴾ (الدھر)

☆ معاون مسئول شعبہ تصنیف و تالیف‘ قرآن اکیڈمی‘ کراچی

’’ہم نے انسان کو (مرد اور عورت) کے ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ ہم اسے آزمائیں‘ پھر اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا۔‘‘

اس کائنات میں تمام بنی نوع آدم کی فوز وفلاح اور نجاتِ اُخروی‘ ربّ ذوالجلال کی حقیقی معرفت اور اس کی رضا وخوشنودی میں مضمر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت وبصارت‘ عقل وفہم اور فراست و دانش مندی کی استعداد وصلاحیتوں سے بہرہ ور فرما کر ابتلا و آزمائش کی بھٹی میں جھونک دیا ہے‘ تاکہ کھرا اور کھوٹا سامنے آجائے۔ ایک طرف معبودِ حقیقی اور انسان کے پالن ہار کی محبت و پرستش اور اطاعت وفرماں برداری کے پُرزور تقاضے ہیں تو دوسری جانب اس دنیا کی زیب وزینت‘ مرغوباتِ نفس‘ عیش وطرب کے دل آویز لمحات اور طاؤس ورباب کی سحر انگیزیاں ہیں۔ اب اس رسّہ کشی کا زور کس طرف زیادہ ہوتا ہے‘ بس یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔

انسان کی تخلیقی کیفیت کے بارے میں تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ، فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ))(۱)

’’ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے‘ پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔‘‘

چنانچہ یہ فطرتِ سلیمہ ہی ہے جس کی صحت کا امتحان مطلوب ہے۔ اس امتحان کے لیے انسان کی عقل وخرد اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ ان ہی دو زاویوں سے انسان کے حوصلہ وہمت‘ اس کی عزیمت اور سیرت وکردار کی پختگی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے ان ہی دو پہلوؤں کی کٹھن آزمائشوں سے گزارا گیا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ پوری طرح شرک وکفر کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ بُت پرستی‘ ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی کا ایک ایسا فسوں طاری تھا کہ جس کے زیر اثر ان کی قوم حق و باطل کی تمیز ہی کھو بیٹھی تھی۔ ملک میں ایک مطلق العنان اور مشرک بادشاہ مسلط تھا‘ جو خدائی کا دعویدار بھی تھا۔ گویا عقائد کا شرک اور اس کا عملی ظہور دونوں عروج پر تھے۔ فسق وفجور

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجنائز‘ باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القدر‘ باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ۔

کی اس گھٹاٹوپ تاریکی میں نورِ توحید کا کوئی ٹمٹماتا ہوا دیا بھی تا حدِّ نگاہ نظر نہ آتا تھا۔

کفر والحاد اور تقلیدِ آباء کے اس ماحول میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی ہوئی حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت کی روشنی میں ایک نعرۂ مستانہ لگایا کہ:

﴿اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ (الانعام)

''بلاشبہ مَیں نے اپنا چہرہ اسی کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور مَیں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔''

اس نعرہ کی گونج اس معبودِ باطل کے ایوانوں سے ٹکرائی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کفر والحاد کے اس بحرِ مردار میں جوار بھاٹا آ گیا۔ دوسری طرف اللہ ربّ العزت نے اس جرأتِ اظہار پر اپنے بندے کی یوں پذیرائی فرمائی:

﴿اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۴﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

''جب وہ (ابراہیم علیہ السلام) آیا اپنے رب کے پاس ایک قلبِ سلیم کے ساتھ۔''

گویا فراست و دانش مندی کے اس امتحان میں سرخروئی حاصل ہوگئی۔ لیکن ع ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں'' کے مصداق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے صبر و ثبات' استقامت و عزیمت' صعوبتوں' کٹھنائیوں اور غیر متزلزل ایمان و یقین کا کڑا امتحان سامنے تھا۔ ذرا دل کی آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ ایک طرف یک و تنہا انسان ہے' دنیاوی اعتبار سے قطعی درماندہ اور تہی دست' کوئی دست و بازو نہیں' نہ کوئی تسلی دینے والا' نہ ہمدردی کے دو بول بولنے والا' نہ چارہ گر نہ کوئی ہمسفر۔ اس نقشِ فریادی کا دوسرا رخ دیکھئے۔ اُدھر گمراہیوں اور شرک کی کثافتوں میں لتھڑا ہوا پورا معاشرہ اور ایک مضبوط نظام قائم ہے' جس کی جڑیں اس بھٹکی ہوئی قوم کی فکر و نظر میں پیوستہ ہیں۔ اس باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنا ایک فردِ واحد کے لیے ایک مفروضے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

قوتِ ایمانی' مصمم ارادہ' جذبہ جنوں اور ذوقِ یقیں دل میں اجاگر ہو تو فولادی زنجیریں بھی کٹ جاتی ہیں' راہ میں آئے ہوئے پہاڑ بھی خس و خاشاک کی مانند بہ جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام عزم و ہمت کے ہتھیاروں سے ہر رکاوٹ کو تہ تیغ کرتے' صبر و ثبات کی گھاٹیاں عبور کرتے' حوصلہ' تحمل' ایثار و قربانیوں سے کوہِ گراں کو پاش پاش کرتے خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف گامزن

رہے۔ محبّتِ الٰہی سے سرشار اس سودائی نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر کے پوری قوم کو غیظ و غضب کی آگ میں جھلسا دیا۔ چنانچہ اس ذلت آمیز شکست پر نظامِ باطل کے ٹھیکیداروں اور بگڑے ہوئے معاشرے کی مجلسِ شوریٰ نے ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے مصداق اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے ایک بڑے الاؤ میں پھینک کر بھسم کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ زندگی سے محروم کر دینے والی اس لرزہ خیز خبر سے بھی اس بطل جلیل کے پائے استقامت میں کوئی لرزش واقع نہیں ہوئی۔ محبّت الٰہی کی اس بلند پروازی اور جذب کی اس کیفیت پر عقل بھی حیران و ششدر رہ گئی۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

صداقت آمیز محبّت اور عرفانِ الٰہی کی انوار و برکات کی بارش نے آگ سے دہکتے الاؤ کو ٹھنڈک اور سلامتی والا سبزہ زار بنا دیا۔ بدن کو راحت وانبساط کی نرمی نے حیاتِ نو عطا کی تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے منعمِ حقیقی سے اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنے کا اظہار کیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝﴾ (الصّٰفّٰت)

''ابراہیم نے کہا: میں تو اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں' یقیناً وہ میری رہنمائی کرے گا۔''

اور اس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے گھر' خاندان' دوست اور اپنے آباء و اجداد کی سرزمین کو خیر باد کہا اور مادرِ وطن کو اشک بار آنکھوں سے دیکھتے اور شیشۂ دل کو ریزہ ریزہ کرتے ہوئے' ایک ان دیکھی منزل اور انجانی راہوں پر چل پڑے۔ اس راہ بے نشاں میں اگر کوئی سہارا تھا تو اسی منعمِ حقیقی' معبودِ برحق اور خالقِ ارض و سماء کا جس کے لیے ساری دنیا سے منہ موڑ لیا گیا تھا کہ ع ''حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی یہ درد آگیں داستان طویل مسافرت اور مہاجرت سے رقم ہوئی ہے۔ شام' مصر' شرقِ اردن اور حجاز آپؑ کی دعوتِ توحید کا مرکز و محور تھے۔ بس ایک ہی سودا قلب و ذہن میں سمایا ہوا تھا کہ توحید کا یہ کلمہ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل جائے۔ اس راہ میں صحرا بہ صحرا خاک چھانتے چھانتے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ پیرانہ سالی آکاس بیل کی طرح ان

کے وجود پر ظاہر ہونے لگی ہے۔ اس حقیقت کا ادراک ہوا تو صرف ایک ہی فکر نے ذہن میں انگڑائی لی کہ میری زندگی کا سورج غروب ہونے کے بعد توحید فکری اور عملی کے اس مشن کو کون آگے بڑھائے گا۔ گویا ع ''نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے''۔ اپنی زندگی کی محدودیت اور اپنے مشن کی لامحدودیت کا شعوری احساس ذہن کے افق پر مزید گہرا ہوا تو بے اختیار یہ دعا نوکِ زباں پر آ گئی:

﴿رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ (الصّٰٓفّٰت)

''اے میرے رب! مجھے نیک بخت اولاد عطا فرما''

یقیناً وہ ساعت شرفِ قبولیت کی تھی۔ ستاسی برس کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ایک نیک اور صالح بیٹا عطا کیا' جسے خود اللہ عزوجل نے غُلٰمٌ حَلِیۡمٌ قرار دیا۔ جن کے رتبے بلند ہوں ان پر آزمائشیں بھی بہت بھاری ڈالی جاتی ہیں۔ بیٹا جب جوانی کی سرحد میں داخل ہو کر اس قابل ہوا کہ باپ کے مشن میں ان کا دست و بازو بنے تو ایک اور قولِ ثقیل نازل ہوا کہ: ''اپنے لختِ جگر کو اللہ کی راہ میں قربان کر دو''۔ جس کی پوری زندگی آزمائشوں کی چکیوں میں پستے ہوئے گزری ہو' اس حکم پر بھلا اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش کیسے آ سکتی تھی! جو صبر و ہمت کا کوہِ گراں ہو اسے بھلا کون ہلا سکتا ہے! دوسری جانب بیٹا بھی انتہائی سعادت مند اور باپ ہی کی طرح صبر و استقامت کا پیکر تھا۔ اس نے حکمِ الٰہی کو سن کر کہا: ''ابا جان! کر گزریئے جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔'' پھر چشمِ فلک نے یہ نظارہ دیکھا کہ بوڑھے باپ نے جواں سال اکلوتے بیٹے کو زمین پر لٹایا اور بے دریغ گلے پر چھری پھیر دی۔ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور بیٹے کی جگہ مینڈھا ذبح ہو گیا۔ اللہ کی منشا بیٹے کی جان لینا نہیں بلکہ بوڑھے باپ کا امتحان لینا مقصود تھا اور یہ شاید آخری اور کڑا امتحان تھا۔ یہ کیسا انوکھا امتحان تھا جس میں ممتحن کو ہی بس کرنا پڑی۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾﴾ (الصّٰٓفّٰت) ''یقیناً یہ بہت بڑی آزمائش تھی''۔ بیٹے کی جگہ مینڈھے کی قربانی بطور فدیہ قبول ہوئی اور اس کی یادگار کے طور پر وقوعِ قیامت تک جانوروں کی قربانی کا یہ سلسلہ دراز کر دیا گیا۔ یہ ہے حُبِّ الٰہی اور اطاعت و فرماں برداری کی ایک چشم کشا تصویر اور ایمان و یقین کی گہرائی کے ساتھ تصدیق بالقلب کی صحیح تعبیر۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سورۃ الحج میں دو بنیادی ارکان کا ذکر ہے۔ ایک اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کرنا اور دوسرے بیت اللہ کا طواف‘ جبکہ ان دو ارکان میں بھی زیادہ زور قربانی پر ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: اے اللہ کے رسولؐ! ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے‘‘۔ (مسند احمد‘ ابن ماجہ) گویا جانوروں کی یہ قربانیاں اصلاً علامت ہیں اُمّتِ مُسلمہ کی اطاعت و فرماں برداری اور تسلیم و رضا کی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اس کی اصل غرض و غایت یہ بیان کی گئی ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ﴾ (الحج: ۳۷) ’’اللہ کو ان قربانیوں کے گوشت نہیں پہنچتے نہ ان کے خون بلکہ اسے تو تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔‘‘ حصولِ تقویٰ کے لیے سُنّتِ ابراہیمی کی پیروی میں قربانی کا اہم فریضہ بھی شامل ہے‘ جسے مسلمان ہر سال ماہ ذوالحجہ میں مناتے ہیں۔

ہر سال لاکھوں مرد و خواتین حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور کروڑوں جانور سُنّتِ ابراہیمی کو زندہ کرنے کے لیے ذبح کیے جاتے ہیں جس سے ابراہیم علیہ السلام کے سعادت مند اور مطیع و فرماں بردار بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ شعائرِ اسلام پر عمل کروانے سے مقصود اُمّت کے فکر و عمل میں وہ جذبہ بیدار کرنا ہوتا ہے جس سے ان کے اندر اللہ کی بے ریا اطاعت‘ پُرخلوص عبادت اور اللہ کے احکام و فرامین کو بے چون و چرا بجالانے کی تحریک پیدا ہو۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس مادہ پرستی کے دور میں ہر عبادت اور ہر سُنّت ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ قربانی جیسے مقدس فریضے کو بھی اُمّت کے سوادِ اعظم نے محض ایک رسم بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں بھی اسوۂ ابراہیمی کی پیروی کرنے کے بجائے ہم اپنی ناک اونچی رکھنے کی زیادہ فکر کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہمارا ہمسایہ ہم سے زیادہ مہنگا اور جاذبِ نظر جانور لے آئے۔ اب تو موبائل فون اور ویڈیو کیمرے میں اپنے جانور کی عکس بندی کی جاتی ہے تاکہ جس نے قربانی سے پہلے ہمارا جانور نہ دیکھا ہو وہ بھی تصویر میں تو دیکھ ہی لے۔ اپنے اس طرزِ عمل سے ہم خود اپنی عبادات کو ریاکاری اور تصنّع کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔ اخلاص‘ خداترسی اور حصولِ تقویٰ

کے برخلاف دنیاوی برتری اور نام ونمود ہمارا مطمح نظر بن گیا ہے۔ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل ' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

آج ہمارا معاشرہ اسلام اور جاہلیت کے مخلوط تصور سے آلودہ ہو چکا ہے۔ اگر ایک طرف اسلامی تعلیمات اور ہماری تہذیبی روایات کی کچھ روشن اور تابناک جھلکیاں ہیں تو دوسری جانب برصغیر کے تاریخی اثرات اور مغربی ثقافت کی کثافتیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ بہت سے شعائر دین اور خیر کے علی الرغم بڑے پیمانے پر ہمارا معاشرہ غفلت اور بے راہ روی کا شکار ہے۔ توحیدِ خالص کو انسانی زندگیوں میں لانے کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا وہ اُمّتِ مُسلمہ کے ہر فرد کے لیے بہترین زادِ راہ ہے۔ فکری اور عملی انتشار' بے راہ روی' دین و دنیا کی تفریق' سُنّت سے اعراض اور بدعت وخرافات کا روز افزوں پھیلاؤ' ایک معبود برحق کو چھوڑ کر سینکڑوں دیگر معبودانِ باطل کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی اُمّتِ مُسلمہ کے زوال کا اصل سبب ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نوعِ انساں کے لیے کتابوں کا نزول اور ان کی تشریح و توضیح کے لیے انبیاء ورسل علیہم السلام کا سلسلہ قائم ہی اسی لیے کیا کہ ہر بندہ زندگی گزارنے کے لیے روشنی کے ان میناروں سے ہدایت کی راہیں آسانی سے تلاش کر سکے۔ یہی ہمارے لیے رشد و ہدایت کا اصل ذریعہ ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء کے خطاب سے نوازا' اس لیے کہ ان کی حیاتِ طیبہ میں ایثار وقربانی' ربّ العالمین کی اطاعت وخودسپردگی اور عزم و حوصلے کی ایک بے مثال داستان موجود ہے' جو نہ صرف اُمّتِ مُسلمہ کے ہر فرد بلکہ پوری انسانیت کے لیے بہترین اُسوہ ہے۔ اگر ہم نے ان نفوسِ قدسیہ کے نقوشِ پا کو چھوڑ کر کسی اور راستے کا انتخاب کر لیا تو پھر ہماری ہلاکت اور بربادی یقینی ہے۔ کوئی مصنوعی اور خودساختہ مشکل کشا اور حاجت روا نہ ہماری دنیا ہی سنوار سکے گا اور نہ آخرت میں ہمیں اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکے گا۔

(تشکّر: مجلہ اُسوۂ حسنہ' کراچی)

❁❁❁

الصَّلٰوۃُ الوُسطٰی

قرآن مجید میں سیاقِ کلام اور احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

انجینئر مختار فاروقیؒ

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر قاری جب اس آیت پر پہنچتا ہے:

﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ﴿٢٣٨﴾﴾ (البقرۃ)

’’خبردار رہو سب نمازوں سے‘ اور بیچ والی نماز سے‘ اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔‘‘ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

تو لامحالہ نماز کی محافظت کے ضمن میں ’’الصلوٰۃ الوسطیٰ‘‘ کے خصوصی ذکر پر چونک جاتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس نماز کی طرف اشارہ ہے۔ عام قاری یقیناً تفاسیر ہی کی طرف رجوع کرتا ہے (یا علماء سے رجوع کرے گا اور بالواسطہ یہ بھی تفاسیر ہی سے رجوع ہے کہ وہ بھی کسی تفسیر زیر مطالعہ سے دیکھ کر یا ذاتی مطالعہ اور ذوق سے ذہن میں موجود مفہوم کو بیان کر دیں گے)۔

تفاسیر میں اس آیت کی تشریح اور ’’الصلوٰۃ الوسطیٰ‘‘ کے تعین کے بارے میں تقریباً یکساں عبارت اور جملے ملتے ہیں۔ مثلاً تفسیر عثمانی میں ہے:

’’بیچ والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے۔ اس کی زیادہ تاکید فرمائی کہ اس وقت دنیا کا مشغلہ زیادہ ہوتا ہے اور فرمایا: کھڑے رہو ادب سے‘ یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے کہ نماز نہیں پڑھتے۔‘‘

اسی طرح ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہریؒ فرماتے ہیں:

’’درمیانی نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں‘ لیکن راجح قول یہ ہے کہ عصر کی نماز ہے۔ حضرات علی‘ ابن مسعود‘ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وغیرہم کا یہی قول ہے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔‘‘

صاحبِ تدبرِ قرآن جناب امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں:

''اَلصلوٰۃ الوسطٰی کے لفظی معنی تو بیچ والی نماز کے ہیں اور اسلوبِ کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے' تو اس کے جواب میں اہلِ تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔''

صاحب تفہیم القرآن مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو' خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو' اللہ کے آگے اس طرح کھڑے رہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔''

تشریح: ''اصل میں لفظ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' استعمال ہوا ہے۔ اس سے بعض مفسّرین نے صبح کی نماز مراد لی ہے' بعض نے ظہر' بعض نے مغرب اور بعض نے عشاء کی' لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی ﷺ سے منقول نہیں ہے' صرف اہلِ تاویل کا استنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں۔''

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

''کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز عصر ہے۔''

انگریزی تفسیر میں عبداللہ یوسف علی صاحبؒ لکھتے ہیں:

271-The Middle Prayer-Salat ul wusta may be translated 'the best or most excellent prayer'_the weight of authorities seems to be in favour of interpreting this as the Asr prayer——"

اب تک کی تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ الصلوٰۃ الوسطٰی سے مراد زیادہ تر عصر کی نماز ہے' تاہم مفسّرین نے باقی نمازیں بھی اس سے مراد لی ہیں۔ زیادہ تر مفسّرین نے جنگ احزاب کے دن ہونے والے اس واقعے سے استدلال کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی نمازِ عصر فوت ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَلَأَ اللّٰهُ قُبُورَهُمْ وَبُيُوتَهُمْ نَارًا، كَمَا شَغَلُونَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطٰى، حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ)) (متفق عليه)

''اللہ تعالیٰ ان (کفّار و مشرکین) کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے کہ انہوں

نے ہم کو بیچ والی نماز سے مصروف رکھ کر روک دیا' یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔"

اس حدیث میں لفظ "صَلَاۃِ الْوُسْطٰی" آیا ہے اور یہاں اس سے تعین کے ساتھ عصر کی نماز مراد ہے۔ اکثر علماء ومفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں بھی اسی حدیث کی روشنی میں "الصَّلٰوۃ الوُسْطٰی" سے نمازِ عصر ہی مراد لی ہے۔

زیادہ تر مفسرین کرام نے پھر نمازِ عصر کے پیش نظر عصر کے وقت کی اہمیت ونزاکت پر بحث کی ہے۔ اور جن حضرات نے دوسرے معنیٰ کیے ہیں انہوں نے دوسرے اوقات کی اہمیت اور انسانی طبعی رجحانات کے پیش نظر رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے۔

ان سطور میں اس بات کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں سیاقِ کلام' نظمِ قرآن اور دیگر داخلی شہادتوں کے ساتھ ساتھ عام انسانی جبلی تقاضوں اور رجحانات کی روشنی میں "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کے معنی کا تعین ہو سکے۔

اس مقصد کے پیش نظر آگے کی گفتگو درج ذیل مباحث پر مشتمل ہوگی:

(۱) الفاظ کی لغوی بحث

(۲) سیاقِ کلام میں "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کی ترکیب کے تقاضے

(۳) قرآن حکیم کی دیگر شہادتیں اور احادیثِ نبویہ ﷺ سے اقتباس

(۴) حاصل کلام

اب آیئے اسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہوئے مدعا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں محافظت' الصلوٰۃ الوسطیٰ اور قنوت کے الفاظ اہمیت کے حامل ہیں۔ لفظ محافظت باب مفاعلہ ہے حفظ سے' اور قرآن حکیم میں اس فعل کے ثلاثی مجرد اور مزید فیہ میں کئی مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ ثلاثی مجرد میں حافظ اور حافظون بہت زوردار معنی میں استعمال ہوئے۔ جیسے فرمایا گیا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر)

"بے شک ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔"

اسی طرح سورۃ التوبہ (آیت ۱۱۲) میں اہلِ ایمان کی مختلف شانیں بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ﴾

’’اور وہ حفاظت کرنے والے ہیں ان حدود کی جو اللہ نے باندھی ہیں۔‘‘

حفظ‘ حافظ‘ حافظون اور حافظات کے الفاظ کسی معیّن شے کی حفاظت اور اس میں کسی قسم کی دخل اندازی اور رخنہ اندازی کے علاوہ misuse سے بھی بچانے کا زوردار داعیہ رکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ⑤﴾ (المؤمنون)

’’اور وہ اہلِ ایمان اپنی شرمگاہوں کو تھامتے ہیں۔‘‘

جبکہ باب مفاعلہ میں مُحافظة سے حَافِظْ اور حَافِظُوْا امر کے صیغے ہیں۔ اس میں ایک تو مُقاتلہ کی طرح کسی دوسرے فریق یا داعیے کے خلاف مقابلہ کر کے حفاظت کرنے کا مفہوم ہے اور یہ علیٰ کے اضافے کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس کے معنی بار بار ایسا کرنے کے ہیں۔ دیگر ابواب سے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے‘ ہم اس سے اس وقت صرف نظر کر رہے ہیں۔

’’الصَّلٰوة الوُسْطٰی‘‘

لفظ ’’الصَّلٰوة‘‘ تو بالاتفاق نماز کے معنی میں ہے اور آیت میں آگے لفظ ’’قُوْمُوْا‘‘ اور قنوت سے یہ بات مؤکد ہوتی ہے کہ یہ نماز کے لیے ہی آیا ہے۔

الوُسْطٰی : وسط‘ اَوسط سے مؤنث وسطیٰ۔ اس کے معنی بہترین بھی لیے گئے ہیں اور سامنے کی اور بیچ کی چیز کے بھی۔ بیچ کی چیز یا آڑے آنے والی چیز زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ جنگ احزاب کے دن والے واقعے میں یہی ہوا کہ کفّار و معاندین سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری تھا اور ہمہ وقت مستعدی اور vigilance کے نتیجے میں نماز کا وقت آیا اور نکل گیا۔ اس کیفیت میں یہ امکان بھی ہے کہ نماز کے وقت کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ لہٰذا ’’الصلوٰة الوسطیٰ‘‘ وہ نماز ہوگی جو کسی شدید مشغولیت میں ہونے پر سرے سے بھول جائے‘ یا یاد ہونے کے باوجود بالارادہ یا غیر ارادی طور پر آدمی ادا نہ کرے‘ یا اس مشغولیت سے نکل کر ادا کر لی جائے۔ مثلاً آج کے کاروباری حضرات کے لیے ظہر‘ عصر‘ مغرب اور عشاء سب ’’الصلوٰة الوسطیٰ‘‘ کے ضمن میں ہوں گی۔

لفظ قنوت کا معنیٰ ہے ’’لزوم الطاعة مع الخضوع‘‘ یعنی اللہ کی اطاعت لازم پکڑنا عاجزی کے ساتھ۔ قُوْمُوْا کا اضافہ کر کے ہر مشغولیت سے اُٹھ کھڑے ہونے کا مفہوم سامنے لایا گیا ہے۔

آیت زیر مطالعہ سورۃ البقرہ میں جس مقام پر واقع ہوئی ہے وہ قرآن مجید میں عائلی قوانین — نکاح و طلاق کے معاملات کی سب سے طویل اور مفصل بحث کا تکمیلی اور concluding حصّہ ہے۔

گویا بندۂ مؤمن یا مؤمن بندی (مرد ہو یا عورت) کے لیے ایک گھریلو زندگی میں جہاں ان احکام کی پیروی ضروری ہے اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جن کا تذکرہ ان چار رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے‘ وہیں اس آیت میں درج ہدایات کو مدِّنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان رکوعوں میں مرد و عورت یا میاں بیوی کے درمیان بعض پابندیوں کا ذکر ہے‘ پھر علیحدگی کی شکل میں طلاق کی تفصیل اور بچوں کے معاملے میں رضاعت کا ذکر ہے‘ مہر کی ادائیگی وغیرہ جیسے امور پر بحث کی گئی ہے جو گھر کے ادارے میں میاں بیوی کے درمیان ناموافقت کی صورت میں پیش آ سکتے ہیں۔

دوسری صورت وہ ہے کہ میاں بیوی میں حد درجہ محبّت و موافقت کے نتیجے میں دوسری انتہائی صورت پیدا ہو جائے کہ اللہ کے احکام کی وقعت کم ہونے لگے اور نماز جیسی عبادت‘ جو ہر روز پانچ مرتبہ وقت کے تعین کے ساتھ فرض ہے‘ کی اہمیت نگاہوں میں نہ رہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اس پہلو پر بڑے لطیف اور بلیغ انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ توجہ ادھر بھی رہنی چاہیے۔ گویا متاہل زندگی میں مؤمن مرد اور مؤمن عورت کے درمیان جو تعلقات استوار ہوں اور محبّت و مودت کا جو رشتہ قائم ہو وہ دینی فرائض اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے فریم کے اندر اندر ہی رہنا چاہیے۔

آیت زیر مطالعہ میں نماز کی محافظت کے ضمن میں پہلے عمومی موانع اور مشکلات سے متنبہ رہنے اور چوکنا رہنے کا حکم دیا گیا ہے‘ اور پھر عام سے خاص کی طرف توجہ دلانے کے لیے خصوصی طور پر ان نمازوں کی محافظت پر زور دیا گیا ہے جو بندۂ مؤمن کی گھریلو زندگی اور مصروفیات کے دوران آتی ہیں‘ اور ان نمازوں کے راستے میں جو رکاوٹیں آئیں (یعنی بیویوں سے محبّت اور ان کی دلجوئی‘ اولاد کے ساتھ وقت گزارنا اور گھریلو مصروفیات وغیرہ) ان کو فوراً بھانپ لینے اور ان سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

’’الصلوٰۃ الوسطٰی‘‘ کے مزید تعین اور اس کے اہم ترین درجے کو پہچاننے میں قرآن فہمی کے دوسرے اصول سے کام لیں تو مزید انشراحِ صدر حاصل ہوگا اور حکمتِ قرآنی کے کئی مزید گوشے

سامنے آئیں گے۔ وہ اصول ہے: ’’اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعضًا‘‘ یعنی ایک ہی مضمون کا قرآن حکیم میں ایک سے زیادہ بار ذکر ہو تو گویا ایک حصہ دوسرے حصے کی مبہم تفاصیل کو واضح کر دے گا۔

گھریلو زندگی سے متعلق سورۃ النور میں ستر کے احکام (گھر کے اندر کا پردہ) کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ وَلَا عَلَیْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَیْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝۵۸﴾

’’اے ایمان والو! اجازت لے کر آئیں تم سے وہ لوگ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں (لونڈی یا غلام) اور جو کہ نہیں پہنچے تم میں عقل (بلوغ) کی حد کو تین بار: فجر کی نماز سے پہلے اور جب تم اتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت ہیں بدن کھلنے کے تمہارے (اور گویا کہ دوسروں سے چھپنے کے)۔ کچھ تنگی نہیں تم پر نہ ان پر ان وقتوں کے پیچھے (علاوہ)۔ پھرا ہی کرتے ہیں ایک دوسرے کے پاس۔ یوں کھولتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے آگے باتیں‘ اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔‘‘

بندۂ مؤمن کی نجی زندگی میں‘ چاہے شادی شدہ عورت ہو یا شادی شدہ مرد‘ یہ اوقات قربت کے ممکنہ مواقع کے ہو سکتے ہیں اور ایسے موقع پر غسل واجب ہو جاتا ہے‘ لہٰذا موسم کی مناسبت (سردی یا گرمی)‘ گھریلو حالات (جوائنٹ فیملی یا علیحدہ رہائش)‘ غسل کے انتظامات (اٹیچڈ باتھ یا دیگر مشترکہ سہولت) اور طبعی کسل مندی کے علاوہ اضافی طور پر شیطان اور نفس کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے غسل کو عام طور پر delay کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

درج بالا آیت میں اگرچہ ایسے مواقع تو تین ذکر کیے گئے ہیں‘ تاہم عملاً اس کی سرحد پر دو ہی نمازیں واقع ہوتی ہیں‘ رات کو فجر اور ظہر کے بعد نمازِ عصر۔ فلہٰذا —— اس آیت کی رو سے شادی شدہ زندگی میں ’’الصلوٰۃ الوسطیٰ‘‘ نمازِ عصر ہے یا نمازِ فجر‘ اور بندۂ مومن کو ان ہر دو میں سے جو نماز بھی آڑے آ رہی ہو اس کا اہتمام کرنے اور نفس کے مرغوبات سے علیحدہ ہو کر اللہ کی

عبادت کے لیے مرد اور عورت کو عاجزی سے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ گھر گرہستی کی زندگی میں ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' نمازِ فجر یا نمازِ عصر ہے اور اس کی بر وقت ادائیگی عام طور پر دشوار ہو جاتی ہے' اور عملی طور پر بھی ان نمازوں کے بارے میں گھروں میں شدید کوتاہی پائی جاتی ہے۔ نئے شادی شدہ جوڑے تو کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہی ہیں' ادھیڑ عمر کے مسلمان بھی ان نمازوں کی بروقت ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں۔ یہ کوتاہی شوہروں میں بھی بہت ہے' تاہم بیویوں میں زیادہ ہے اور عام طور پر اکثر عورتیں اس طرح نمازِ فجر یا نمازِ عصر کو قضا کر دیتی ہیں۔

اس تقصیر میں یقیناً اگر شوہر کی قوامیت' جبر و قہر اور ہر قیمت پر اپنی خواہش کو پورا کرنے کا جذبہ کارفرما ہو تو اس گناہ کا زیادہ بوجھ بھی اسی کے حصے میں آئے گا' اور اگر بیوی کی کسل مندی اور طبعی سستی کو دخل ہے تو اس کے لیے نمازوں کو قضا کرنا آخرت میں وبالِ جان بنے گا۔

میانہ روی اور اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ والدین بھی اولاد کی شادی اور رخصتی کے موقع پر نمازوں کی بروقت ادائیگی کی تلقین کریں' اور شوہروں کو بھی ہر قیمت پر اپنے جذبات کی تسکین کی بجائے مصالحانہ' مشفقانہ اور معتدل رویہ اپنانا چاہیے تاکہ میاں بیوی دونوں اس دنیا میں بھی پُرسکون زندگی بسر کر سکیں اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہو جائے۔ گویا ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کا التزام اور محافظت بہت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اوپر سورۃ النور کی آیت کے حوالے سے جن تین مواقع کا ذکر ہے ان تخلیہ کے لمحات کو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی کر کے تقربِ خداوندی کا ذریعہ بنانا چاہیے' جو کہ ذرا سی محنت اور توجہ سے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ کام ذرا مشکل ضرور ہوگا' ناممکن نہیں ہے۔

آیت زیر مطالعہ میں آغاز میں عمومی محافظتِ صلوٰۃ کا تذکرہ ہے اور پھر خاص کی طرف توجہ کو مبذول کرایا گیا ہے۔ اس انداز میں اگر استدلال کو منطقی طور پر مزید آگے بڑھایا جائے تو اہلِ دل اور اہلِ ذوق کے لیے ایک اور لطیف اشارہ بھی ملتا ہے۔ نمازِ فجر رات کے لمحاتِ تخلیہ میں آڑے آتی ہے اور نمازِ عصر دن کے ظہیرہ (قیلولہ) کے لمحات میں اللہ کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں ذرا رُک کر غور کریں اور ایمان کے درجات کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو حکمت کا ایک اور دروازہ کھل جاتا ہے۔

حقیقی ایمان کے درجات بے شمار ہیں‘ تاہم سورۃ الواقعہ میں مقربین کو سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز بتایا گیا ہے۔ اسی طرح محسنین کو دیکھیں یا صادق الایمان کی اصطلاح کی حقیقت پر نظر کریں‘ عاشقانِ ذاتِ الٰہی کا گروہ ہو یا عاشقانِ رسول ﷺ ہوں‘ مؤمن کامل کہہ لیں یا مردِ مؤمن‘ بات اتنی سی ہے کہ اس درجے کے اہلِ ایمان کے نزدیک پانچ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کا اہتمام بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور لسانِ رسالت سے اس کی فضلیت پر بہت سی صحیح حدیثیں کتبِ احادیث میں وارد ہیں۔ جناب حضرت محمد ﷺ کے لیے تو نمازِ تہجد کی اہمیت بہت ہی زیادہ تھی‘ تاہم آپ کے اُمتیوں میں سے بھی جس جس کا ایمان ایک خاص درجہ تک ترقی کرتا ہے اس کے لیے نمازِ تہجد کا التزام اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

فلہٰذا ---- عموم سے خاص کی طرف استدلال کا تقاضا یہ ہے کہ نمازِ فجر وعصر میں سے نمازِ فجر سے رات کے تخلیہ کے کنارے پر نمازِ تہجد سمجھی جائے۔ یعنی ایمان کے اعلیٰ درجات کا تقاضا یہ ہے کہ متاہل زندگی میں میاں اور بیوی دونوں کے لیے نمازِ فجر کا اہتمام تو ہونا ہی چاہیے بلکہ نمازِ تہجد کو بھی کما حقہ اہمیت دیتے ہوئے اس کو بھی ’’الصلٰوۃ الوسطٰی‘‘ سمجھ کر ہوشیار ہو جانا چاہیے اور اس کا بھی اہتمام ضروری ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ تو اس نماز کا شایانِ شان اہتمام فرماتے ہی تھے جو انہی کے مقام بلند کی مناسبت سے تھا‘ تاہم آپ ﷺ نے عام اہلِ ایمان کے لیے ترغیب وتشویق کے انداز میں اس کے اہتمام کا حکم فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ آپؐ نے کسی مؤمن میاں بیوی (بالخصوص جوان) کی مثال دے کر ایک حدیث میں دعا دیتے ہوئے مقامِ مدح میں فرمایا کہ اگر مرد تہجد کے لیے اُٹھے تو بیوی کو جگائے اور سستی کرنے پر بے تکلفی کی وجہ سے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے‘ اور اگر بیوی اُٹھ جائے تو وہ شوہر کو جگائے اور سستی پر اسی طرح اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے تاکہ نیند سے بیدار ہو جائے اور دونوں اللہ کے حضور عبادت میں لگ جائیں ﴿وَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ﴾۔

جناب نبی اکرم ﷺ تو تہجد کا بھی بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور اس کی کیفیت پر بہت سے صحابہ کرام ؓ کی روایات شاہد ہیں‘ تاہم آپ ﷺ منفرد شان کے مالک تھے تو آپ کے معاملات میں بھی انفرادی شان پائی جاتی ہے اور اس کا climax اور ذروۂ سنام ایک روایت ہے جو اگرچہ بعض وجوہات کی بنا پر ہم یہاں نقل نہیں کر رہے‘ تاہم اس کی تفصیل ابن کثیر

میں علامہ ابن کثیرؒ نے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیات ۱۹۰ تا۱۹۵ کی تفسیر میں تین اصحابؓ کے سوال پر کہ آنحضرت ﷺ کی کون سی ادا سب سے عجیب تھی؛ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی روایت سے درج کیا ہے؛ وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ

☆ قرآن مجید میں نمازوں کی حفاظت کا عمومی حکم بھی ہے اور اہلِ ایمان کی شان یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی مطلقاً حفاظت کرتے ہیں؛ اور حدیث میں وقت پر نماز کی ادائیگی کو افضل نماز کہا گیا ہے۔ (سورۃ المومنون؛ سورۃ المعارج)

☆ آیت زیر مطالعہ میں امر کے صیغے کے ساتھ گھریلو اور متاہل زندگی کے پس منظر میں اہلِ ایمان کو نمازوں کی محافظت کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یہاں خصوصی مرغوبات اور نفس کی پسندیدہ چیزوں کے علی الرغم نمازوں کی پابندی اور اہتمام کا اشارہ ہے۔

☆ عام سے خاص کی طرف سلسلۂ کلام میں ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کہہ کر گھریلو زندگی میں ہر نماز اور مؤمن مرد اور عورت (میاں بیوی) کے رات کے تنہائی کے لمحات کے بعد نمازِ فجر اور دوپہر کے قیلولہ کے بعد نماز عصر کے خصوصی اہتمام کا حکم ہے۔

☆ مزید گہرائی میں جائیں تو حکمتِ قرآنی اور حکمتِ نبوی ﷺ کا یہ خزانہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس مقام پر مؤمن شوہر اور مؤمن بیوی کے لیے نمازِ تہجد کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے درجے اور اعلیٰ ترین مقام بندگی پر فائز اہلِ ایمان کے لیے ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' نمازِ تہجد بھی ہوسکتی ہے؛ اگرچہ ہمارے لیے یہ فرض نہیں تاہم اس کی فضیلت اپنی جگہ پر ہے۔

گویا —— مفسّرین کے اقوال کے مطابق ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' تو ان ہی پانچ نمازوں میں سے ہی کوئی قرار پائی اور نمازِ فجر اور نمازِ عصر پر زورِ استدلال ہے؛ تاہم مندرجہ بالا صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کے قرائن اور احادیث اور سنّتِ نبویؐ سے اس کو مدلّل کر کے پیش کیا جائے؛ تاکہ ہر قاری نہ صرف نتیجہ تک پہنچ سکے بلکہ اس کے ساتھ استدلال کی کڑیاں خود ملانے پر اس کو ایک درجے میں اطمینانِ قلب بھی میسّر ہو؛ تاکہ وہ یکسوئی اور بھرپور جذبۂ عمل کے ساتھ اس چیز کے حصول میں لگ جائے جس ذوق وشوق اور لگن کا یہ آیت تقاضا کرتی ہے۔

❁❁❁

حکم صرف اللہ کا!

میاں محمد جمیل☆

اللہ تعالیٰ کے احکم الحاکمین ہونے کے ثبوت اور اس کی حاکمیت کے دلائل جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ''اللہ'' کی ذات کا ایک جامع تصوّر اپنے ذہن میں تازہ کریں۔ یوں ہمارے ایمان میں تازگی' ایقان میں پختگی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق میں وارفتگی پیدا ہو جائے گی کہ ہم نے اسے کیوں اپنا حاکم ماننا اور ہر حال میں کس لیے اس کا حکم تسلیم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کا حکم ماننا اس لیے ضروری ہے کیونکہ وہ صرف ہمارا خالق' مالک' رازق اور معبود ہی نہیں بلکہ ہمارا بادشاہ اور حاکم بھی ہے۔ اُس کا فرمان ہے:

﴿الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ②﴾ (الفرقان)

''اللہ ہی کے لیے زمین و آسمانوں کی بادشاہی ہے' اس نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور اُس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی تقدیر مقرر فرمائی۔''

﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ⑧③﴾ (یٰس)

''پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جانے والے ہو۔''

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ②③﴾ (الحشر)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ بادشاہ ہے نہایت پاک' سراسر سلامتی والا' امن دینے والا' نگرانی کرنے والا' اپنا حکم نافذ کرنے پر پوری طرح بااختیار اور بلند و بالا ہے۔''

☆ پرنسپل' ابوہریرہ شریعہ کالج' لاہور

﴿اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾﴾ (التین)

''کیااللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟''

اُس کے ہر حکم میں حکمت اور خیر خواہی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کسی کو اختیار حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنائے اور ان پر اپنا حکم چلائے ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اُسی کا حکم چلنا چاہیے' کیونکہ وہ سب سے بڑا حاکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۟ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا ۙ وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ ؕ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۵۴﴾﴾ (الاعراف)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر عرش پر مستوی ہوا' وہ رات کو دن پر اوڑھاتا ہے جو تیز چلتا ہوا' رات کے پیچھے چلا آتا ہے' اور اُس نے سورج' چاند اور ستارے پیدا کیے جو اُس کے حکم کے تابع ہیں۔ سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اُسی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑی برکت والا ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو حاکم تسلیم کروانے اور اپنا حکم منوانے کے لیے اپنی قدرت اور خالق ہونے کی بڑی بڑی نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جس ''اللہ'' کا تم نے حکم ماننا ہے وہی تمہارا رب ہے اور اسی نے سات آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر اپنی شان کے مطابق عرش پر جلوہ افروز ہوا۔ وہی رات اور دن کے نظام کو چلانے والا ہے اور اسی نے سورج' چاند اور ستاروں کو مسخر کر رکھا ہے۔ لوگو! کان کھول کر سُن لو وہی سب کو پیدا کرنے والا ہے' اس لیے حکم بھی اُسی کا چلنا چاہیے' کیونکہ وہ بڑا برکت والا اور ربّ العالمین ہے۔

اس فرمان میں اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات اور اس کے اہم ترین اجزاء کا نام لے کر بتلایا ہے کہ یہ میرے تابع ہیں اور میرے ہی حکم پر اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اے انسان! تُو اپنے آپ پر غور کر کہ ان کے مقابلے میں تیری حیثیت تو نہایت معمولی ہے۔ جب کائنات کے بڑے بڑے اجسام میرے حکم پر چل رہے ہیں تو تجھے بھی میرا ہی حکم ماننا چاہیے۔

﴿فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ﴿۱۲﴾﴾ (المؤمن)

”حکم دینے کا اختیار اللہ بزرگ و برتر ہی کا ہے۔“

یہی بات حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اور حضرت یوسف علیہ السلام نے قید کے دوران اپنے ساتھیوں کو سمجھائی تھی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ (یوسف)

”یعقوب نے کہا: اے میرے بیٹو! (شہر میں) ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ میں اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو تم سے ٹال نہیں سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا، اور لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے اُسی پر بھروسا کیا کریں۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کی نصیحت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ مصر میں قحط سالی کی وجہ سے امن وامان کا مسئلہ بھی پیدا ہو چکا تھا، جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہو جایا کرتا ہے۔ اس صورت حال میں گیارہ آدمیوں کے جتھے کو، جن میں ایک سے ایک بڑھ کر کڑیل جوان اور حسن و جمال کا پیکر موجود تھا، انتظامیہ مشکوک نگاہوں سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ تم وہاں اجنبی اور پردیسی ہو گے، اس لیے تمہیں ایک جتھے کی شکل میں ایک ہی دروازے سے داخل ہونے کی بجائے مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہونا چاہیے۔ یہ ایک احتیاطی تجویز ہے، ورنہ میرا اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہے اور اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے تمہارا بھی اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر بھروسا کرنے والوں کے معاملات کو آسان فرما دیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بے گناہ ہونے کے باوجود پابندِ سلاسل کر دیے گئے۔ اس حالت میں بھی انہوں نے اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہیں کہ حقیقی حاکم تو اللہ تعالیٰ ہے۔ فرمایا:

﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ (یوسف)

''تم نہیں عبادت کرتے اُس (اللہ تعالیٰ) کے سوا مگر چند ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے محض نام رکھ لیے ہیں' اللہ نے ان کے بارے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی اصل دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

بالآخر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے' کیونکہ حکم دینا اللہ کا اختیار اور کام ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ''دین قیم'' کے الفاظ استعمال فرما کر یہ بھی سمجھایا کہ جس کے پاس عقیدۂ توحید نہیں' اس کے پاس کچھ بھی نہیں بے شک وہ کتنا پاک باز اور دین دار ہونے کے دعوے کرتا پھرے۔ حقیقی معبود تو اللہ تعالیٰ ہے' مگر اکثر لوگ اس بات کو جاننے اور ماننے کی کوشش نہیں کرتے۔

چند آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں:

﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾﴾ (یونس)

''اس کی پیروی کریں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کریں یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔ وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾ (القصص)

''اس اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اوّل و آخر اُسی کی تعریف ہے' اور حکم دینے کا اختیار اُسی کو ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جانے والے ہو۔''

﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾﴾ (الانعام)

''پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو اُن کا سچا مالک ہے۔ سن لو! حکم اُسی کا چلتا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١١٤﴾﴾ (الانعام)

''کیا مَیں اللہ کے سوا کوئی اور حَکم تلاش کروں' جب کہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف ایک بڑی مفصل کتاب نازل فرمائی ہے۔ اور (اے نبی ﷺ!) جنہیں ہم نے (پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل کی گئی ہے آپ کے رب کی طرف سے

حق کے ساتھ‘ پس آپ ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں میں سے۔‘‘

﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ (الکھف)

’’اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔‘‘

اہل لوگوں کو ذمہ داری دینے کا حکم

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾﴾ (النسا)

’’یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل لوگوں کے حوالے کرو‘ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ جس کی تمہیں نصیحت کر رہا ہے یقیناً یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔‘‘

اس فرمان میں ہر قسم کی امانتوں کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے جس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دینی‘ سیاسی اور انتظامی ذمہ داری بھی اہل لوگوں کو دینی چاہیے‘ کیونکہ جب تک اہل لوگ آگے نہیں ہوں گے اور وہ اپنی ذمہ داری ٹھیک طور پر پوری نہیں کریں گے‘ قانون کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس کے بہتر نتائج نہیں نکل سکتے۔

اہلِ منصب کا فیصلہ سازی میں جذبات پر قابو

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾﴾ (ص)

’’اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے‘ لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک گئے ان کو سخت عذاب ہوگا‘ کیونکہ انہوں نے آخرت کے حساب کو فراموش کر دیا ہے۔‘‘

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاۗءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ

آتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ (المومنون)

''اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین' آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا سب تباہ ہو جاتا' بلکہ ہم ان کو نصیحت کرتے ہیں اور وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔''

اسلام کے نظامِ عدل وقسط میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا نفاذ کس انداز سے کیا جاتا ہے' اس کی ایک جھلک خود دورِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا اَنَّ قُرَیْشًا أَھَمَّھُمْ شَأْنُ الْمَرْأَۃِ الْمَخْزُوْمِیَّۃِ الَّتِیْ سَرَقَتْ، فَقَالُوْا: مَنْ یُکَلِّمُ فِیْھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ فَقَالُوْا: مَنْ یَّجْتَرِئُ عَلَیْہِ اِلَّا اُسَامَۃُ بْنُ زَیْدٍ ؓ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَکَلَّمَہٗ اُسَامَۃُ ؓ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((أَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ!)) ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ: ((اِنَّمَا اَھْلَکَ الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْہُ وَ اِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الضَّعِیْفُ اَقَامُوْا عَلَیْہِ الْحَدَّ، وَایْمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ ﷺ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا)) (رواہ مسلم: باب قَطْعِ السَّارِقِ الشَّرِیْفِ وَغَیْرِہٖ وَالنَّھْیِ عَنِ الشَّفَاعَۃِ فِی الْحُدُوْدِ)

''حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی۔ اس صورت حال پر قریش کے لوگ پریشان ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس عورت کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں کس سے سفارش کروائی جائے۔ انہوں نے سوچا کہ اُسامہ بن زید ؓ نبی ﷺ کے پیارے ہیں' ان کے سوا یہ جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسامہ ؓ نے آپؐ سے عرض کی۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے اسامہ سے فرمایا: ''کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' آپؐ کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ اسی لیے ہلاک ہوئے کہ ان میں کوئی بڑے طبقے کا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے' اور جب کوئی چھوٹا آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کرتے۔ اللہ کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو مَیں اُس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

ذمہ دار لوگوں کے ساتھ اختلاف

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ
تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿59﴾﴾ (النساء)

’’اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان کی بھی جو تم میں صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارا کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر اللہ اور قیامت کے دن پر تمہارا ایمان ہے۔ یہ نتائج کے اعتبار سے بہتر اور بہت اچھا طریقہ ہے۔‘‘

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ
مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿36﴾﴾ (الاحزاب)

’’کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں تو پھر انہیں اپنے معاملے میں کچھ اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ جائے گا۔‘‘

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا
تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿105﴾﴾ (النساء)

’’یقیناً ہم نے آپ کی طرف برحق کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ جو آپ کو اللہ نے سیدھا راستہ دکھایا ہے اس کے مطابق فیصلے کریں۔ اور خیانت کرنے والوں کی حمایت کرنے والے نہ ہو جانا۔‘‘

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ
الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿60﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿61﴾﴾ (النساء)

’’کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ آپ پر اور آپ سے پہلے اُتارا گیا وہ اس کو مانتے ہیں، لیکن وہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں دور کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم اور رسول کی طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ منافق آپ سے کنّی کتراتے ہیں۔‘‘

حکمِ الٰہی کو نافذ نہ کرنے والے مجرم

بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ؀﴾ (المائدہ)

''اورہم نے تورات میں ان کے لیے لازم کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بھی بدلہ ہے۔ پھر جسے قصاص معاف کر دیا جائے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو ظالم ہیں۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ؀﴾ (المائدہ)

''اور جو اللہ کے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو کافر ہیں۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ؀﴾ (المائدہ)

''اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ نافرمان ہیں۔''

قانونِ الٰہی کی برکات

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ؀﴾ (المائدہ)

''اگر وہ واقعی تورات اور انجیل نافذ کرتے اور جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے تو ضرور اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے ایک جماعت سیدھے راستے پر ہے' اور بہت سے ان میں بُرے کام کرنے والے ہیں۔''

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ؀﴾ (الاعراف)

''اور اگر بستیوں والے صحیح طور پر ایمان لے آتے اور اللہ سے ڈرتے تو ان پر ہم ضرور آسمان اور زمین سے برکات نازل کرتے' لیکن انہوں نے جھٹلا دیا' پس ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں پکڑ لیا۔''

برکت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کی عمر میں برکت پیدا کر دی جائے تو وہ تھوڑی مدّت میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دے پاتا ہے کہ جس سے لوگ مدّت تک استفادہ کرنے کے ساتھ اسے یاد رکھتے ہیں۔ خورد و نوش میں برکت پیدا ہو جائے تو آدمی کے لیے پانی کے چند گھونٹ اور خوراک کے چند لقمے ہی کافی ہو جاتے ہیں۔ اگر برکت اٹھالی جائے تو سب کچھ ہونے کے باوجود آنکھیں سیر نہیں ہوتیں اور پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود طبیعت مطمئن نہیں ہوتی اور انواع و اقسام کے کھانے اس کی قوت و توانائی میں اضافہ نہیں کرتے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ)) (رواه البخاری: باب الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ)

''غنا (دولت مندی) مال کی کثرت سے نہیں بلکہ اصل غنا تو دل کے استغنا سے حاصل ہوتی ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِقَامَةُ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ مَطَرِ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً فِيْ بِلَادِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) (رواه ابن ماجه: باب إقامة الحدود [صحيح])

''اللہ کی حدود میں سے کسی ایک حد کو نافذ کرنا چالیس دن کی بارش سے بہتر ہے۔''

فصلوں میں سب سے زیادہ پانی کی ضرورت چاول کی فصل کو ہوتی ہے۔ یہ فصل بھی دس گیارہ مرتبہ پانی ملنے سے تیار ہو جاتی ہے۔ چالیس مرتبہ بارش کو اس پر تقسیم کریں' اگر ہر موسم میں اتنی بارشیں ہوں تو ملک کی زراعت اتنی مضبوط اور بجلی کی اس قدر بچت ہو گی کہ جس کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے۔

❁❁❁

اچھا کون' بُرا کون!

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ معلم اخلاق تھے۔ قرآن شریف میں بھی آپؐ کا اسی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا: ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ صَالِحَ الْاَخْلَاقِ)) (رواہ احمد) ''میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں۔'' آپؐ نے اخلاقی خوبیوں کی نہ صرف تعلیم دی بلکہ ان کو عملی طور پر اختیار کر کے بھی دکھایا۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کی زندگی کو اہلِ ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔'' اسی طرح آپؐ نے اخلاقی برائیاں بھی بتا دیں تاکہ لوگ ان سے بچ کر رہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَفَ عَلٰى اُنَاسٍ جُلُوْسٍ فَقَالَ: ((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ؟)) قَالَ: فَسَكَتُوْا، فَقَالَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ رَجُلٌ: بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، اَخْبِرْنَا بِخَيْرِنَا مِنْ شَرِّنَا، فَقَالَ: ((خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَيُؤْمَنُ شَرُّهٗ، وَشَرُّكُمْ مَنْ لَا يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَلَا يُؤْمَنُ شَرُّهٗ)) (رواہ الترمذی)

''صحابہ کرامؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: بولو کیا مَیں تمہیں یہ نہ بتا دوں کہ تم میں بہترین شخص کون ہے اور بدترین کون؟ راوی کہتا ہے: حاضرین اس پر خاموش ہو گئے (اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا)۔ تین بار آپؐ نے یہی فرمایا۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ضرور بتایئے کہ ہم میں بہترین کون ہے اور بدترین کون۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں بہترین شخص تو وہ ہے جس کی جانب سے بھلائی کی امید کی جائے اور برائی کا کوئی خطرہ بھی محسوس نہ کیا

جائے‘ اور بدترین وہ ہے جس کی جانب سے بھلائی کی کوئی امید نہ ہو اور برائی کا ہر وقت خطرہ لگا رہے۔‘‘

اچھا انسان بننے کے لیے جامع ترین الفاظ میں وضاحت کر دی گئی۔ اسی طرح بتا دیا گیا کہ بُرا انسان وہ ہے جو دوسروں کا ہمدرد اور خیر خواہ نہ ہو۔ اسی بات کو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ)) (رواہ البخاری و مسلم وغیرھما)

’’حقیقی مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے تمام مسلمان محفوظ رہیں‘ اور اصل مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔‘‘

اچھے کام کرنے اور برے کاموں سے بچنے کے لیے ہاتھوں اور زبان کو کنٹرول میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ان سے جائز کام لینے والا اچھا انسان جبکہ ان کو دوسروں کے لیے اذیت کا باعث بنانے والا برا انسان ہے۔ گویا مسلمان تو وہ ہے جو دوسروں کے کام آنے والا ہو اور کسی کو دکھ دینے والا نہ ہو۔ اسی طرح بتا دیا گیا کہ ہجرت یہی نہیں کہ انسان اپنے وطن کو خیرباد کہہ دے اور نقل مکانی کر کے کسی اور جگہ جا بسے‘ بلکہ اصل ہجرت تو یہ ہے کہ وہ تمام برائیوں کو چھوڑ دے اور صرف وہ کام کرے جو دوسروں کے لیے مفید ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن اس شخص کو فرمایا جو امن پسند ہو اور دوسرے لوگوں کی جان اور مال کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ))(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

’’ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے۔ پس اللہ کو اپنی ساری مخلوق میں زیادہ محبت ان بندوں سے ہے جو اس کی عیال کے ساتھ احسان کریں۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ پوری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا وہ اچھا انسان ہو گا اور جو ان کو نقصان پہنچائے گا وہ بُرا ہو گا۔ انسان چونکہ اشرف مخلوق ہے لہٰذا وہ اچھے سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے لیکن مخلوق کا کوئی بھی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں۔ حلال جانور کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانے کی اجازت ہے مگر

ذبح سے پہلے اس کو بھوکا پیاسا رکھنا جرم ہے۔ جانور کو ذبح کرنا ہو تو چھری خوب تیز ہوتا کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ آج ایک محکمہ ہے جسے ''انسدادِ بے رحمی حیوانات'' کہا جاتا ہے۔ اس محکمے کی بنیاد تو درحقیقت رسول اللہ ﷺ نے رکھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ ﷺ کے چند اصحاب آپؐ کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرے تو ایک صاحب چڑیا کے بچے اٹھا لائے۔ وہ چڑیا اپنے بچوں کے گرد منڈلانے لگی۔ آپؐ نے دیکھا تو اسے اچھا نہ جانا اور حکم دیا کہ جوان بچوں کو اٹھا لایا ہے وہ اُنہیں واپس رکھ کر آئے تاکہ ان کی ماں آسودہ ہو۔ پالتو جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ضروری ہے۔ ان کے آرام کا خیال رکھا جائے اور انہیں پیٹ بھر کر غذا فراہم کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کسی جگہ سے گزر رہے تو ایک اونٹ نے آپؐ کو دیکھ کر درد بھری آواز نکالی۔ آپؐ نے اس کے مالک کو بلا کر کہا کہ اس سے کام اس کی طاقت کے مطابق لیا کرو اور غذا پوری دیا کرو۔ اس جانور نے مجھ سے شکایت کی ہے۔

وہ لوگ برے ہیں جو تفریح طبع کے لیے جانوروں کو لڑاتے ہیں اور ان کی لڑائی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ باربردار جانور تو انسانوں کے خدمت گار ہیں۔ اُن سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے سے منع کیا گیا ہے۔ لوگ گدھے سے کام لیتے ہیں اور اس دوران اس کو بے رحمی سے مارتے بھی ہیں۔ خدا ترس بندہ ایسا نہیں کرتا۔ تمام جاندار اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اچھے سلوک کے مستحق ہیں۔ اُن میں نقصان دہ جانور اور درندے بھی شامل ہیں۔ سانپ‘ چوہے وغیرہ کو جان سے مار دینے کا حکم ہے تاکہ وہ دوسرے انسانوں کو نقصان نہ پہنچائیں‘ مگر ظلم کرنا ان پر بھی جائز نہیں۔ موذی جانور کو تکلیف دے کر مارنا درست نہیں بلکہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ عوام کی گزرگاہ سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹانا بھی کوئی معمولی نیکی نہیں‘ کیونکہ اگر اسے نہ ہٹایا جائے تو وہ گزرنے والوں کے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ دوسروں کو نقصان اور تکلیف سے بچانا اسلامی اخلاق کا ایک پہلو ہے۔

درخت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ جو شخص درخت لگاتا ہے وہ اچھا کام کرتا ہے۔ اس لیے بلاضرورت درخت کاٹنا کوئی احسن فعل نہیں۔ حضرت ابوبرزہ اسلمی ؓ سے روایت ہے کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے نفع دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِعْزِلِ الْاَذَى عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ)) (رواہ مسلم)

''مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹادیا کرو۔''

حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ)) (رواہ الترمذی)

''جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اُس کو فریب دے وہ ملعون ہے۔''

راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کی نصیحت آپؐ نے بار بار کی ہے۔ معاویہ بن قرہ کہتے ہیں کہ مَیں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی راستہ پر جا رہا تھا۔ ان کا کسی ایسے پتھر وغیرہ پر گزر ہوا جو گزرنے والوں کے لیے باعث تکلیف تھا۔ انہوں نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔ آگے چل کر میں نے بھی اسی قسم کا ایک پتھر دیکھا تو مَیں نے بھی اس کو ایک طرف ڈال دیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ مَیں نے کہا: آپ کو دیکھا تو مَیں نے بھی وہی عمل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے:

((مَنْ اَمَاطَ اَذًى عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ كُتِبَ لَهٗ حَسَنَةٌ، وَمَنْ تُقُبِّلَتْ مِنْهُ حَسَنَةٌ دَخَلَ الْجَنَّةَ))(اخرجه البخاری فی الادب المفرد)

''جو کوئی مسلمانوں کے راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دے تو اُس کے حق میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے' اور جس کی ایک نیکی بھی قبول ہو جائے وہ بھی آخر کار جنت میں چلا جائے گا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس شخص کو بھی جنت کی بشارت دی جس نے درخت کی ایسی شاخ کاٹ دی جو گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ، فَقَالَ لَاُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ، فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ)) (متفق علیه)

''ایک شخص کا کسی ایسے راستہ سے گزر ہوا جس پر درخت کی ایک شاخ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ مَیں اس شاخ کو مسلمانوں کے راستے سے ہٹا کر رہوں گا تاکہ ان کو تکلیف نہ دے۔ بس اسی بات پر وہ جنت میں داخل کر دیا گیا۔''

دوسروں کے لیے آسودگی کا باعث ہونا' مدد کرنا اور ہمدردی کرنا بڑے ثواب کے کام

ہیں۔ اگر یہ نہیں تو عبادات کے نابود ہونے کا امکان ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا:

((اِنَّ فُلَانَۃَ تُذْکَرُ مِنْ کَثْرَۃِ صَلَاتِھَا وَصِیَامِھَا وَصَدَقَتِھَا، غَیْرَ اَنَّھَا تُؤْذِیْ جِیْرَانَھَا بِلِسَانِھَا، قَالَ: ((ھِیَ فِی النَّارِ)) قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! فَاِنَّ فُلَانَۃَ تُذْکَرُ قِلَّۃَ صِیَامِھَا وَصَدَقَتِھَا وَصَلَاتِھَا، وَاِنَّھَا تَصَدَّقُ بِالْاَثْوَارِ مِنَ الْاَقِطِ، وَلَا تُؤْذِیْ بِلِسَانِھَا جِیْرَانَھَا، قَالَ: ((ھِیَ فِی الْجَنَّۃِ)) (رواہ احمد))

’’یارسول اللہ ﷺ! فلاں بی بی کی نماز‘ روزے اور صدقہ وخیرات کرنے کے حوالے سے بڑی شہرت ہے مگر اس میں ایک عیب بھی ہے‘ وہ یہ کہ وہ ہمسایوں کو بُرا بھلا کہتی ہے۔ فرمایا: ’’وہ دوزخ میں ہے‘‘۔ پھر اس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اور فلاں عورت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ روزے‘ نماز اور صدقہ وخیرات اس کثرت کے ساتھ تو ادا نہیں کرتی البتہ صرف پنیر کے چند ٹکڑے راہ خدا میں دے دیتی ہے‘ لیکن اس میں ایک بڑا ہنر یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے کوئی تکلیف نہیں پہنچاتی۔ فرمایا: ’’وہ جنت میں ہے۔‘‘

ایک عورت جس نے ایک بلی کو بھوکا پیاسا مار دیا وہ عتاب کی مستحق ٹھہری۔ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((دَخَلَتِ امْرَاَۃٌ النَّارَ فِیْ ھِرَّۃٍ رَبَطَتْھَا، فَلَمْ تُطْعِمْھَا وَلَمْ تَدَعْھَا تَاْکُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ)) (متفق علیه)

’’ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لیے جہنم میں ڈالی گئی کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ کے رکھا (اور بھوکا مار ڈالا)۔ نہ تو اسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اُسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے اپنی غذا حاصل کر لیتی۔‘‘

یہ بے رحم عورت بنی اسرائیل میں سے تھی اور آنحضرت ﷺ نے شبِ معراج میں یا خواب میں یا بیداری کے کسی اور مکاشفہ میں اس کو دوزخ میں بچشم خود عذاب میں مبتلا دیکھا۔ انسان تو پھر انسان ہیں‘ جانوروں کے ساتھ بھی بے رحمی‘ بے دردی اور ظلم کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناراض کرنے والا اور جہنم میں لے جانے والا عمل ہے۔ بے زبان جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک بہت

بڑی نیکی ہے جو بخشش کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((بَيْنَا رَجُلٌ يَمْشِيْ بَطَرِيْقٍ اِشْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطْشُ، فَوَجَدَ بِئْرًا فَنَزَلَ فِيْهَا فَشَرِبَ، ثُمَّ خَرَجَ فَإِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرٰى مِنَ الْعَطَشِ، فَقَالَ الرَّجُلُ: لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا الْكَلْبَ مِنَ الْعَطْشِ مِثْلَ الَّذِيْ كَانَ قَدْ بَلَغَ مِنِّيْ، فَنَزَلَ الْبِئْرَ فَمَلَأَ خُفَّهُ مَاءً ثُمَّ اَمْسَكَهٗ بِفِيْهِ، حَتّٰى رَقِيَ فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ فَغَفَرَ لَهٗ)) قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ اَجْرًا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ فِيْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ)) (متفق علیہ)

''اس اثناء میں کہ ایک آدمی راستہ پر چلا جا رہا تھا' اسے سخت پیاس لگی۔ چلتے چلتے اسے ایک کنواں ملا۔ وہ اس کے اندر اُترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اُس نے دیکھا کہ ایک کُتّا ہے جس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور پیاس کی شدّت سے وہ کیچڑ کھا رہا ہے۔ اس آدمی نے دل میں کہا کہ اس کُتّے کو بھی پیاس کی ایسی ہی تکلیف ہے جیسی کہ مجھے تھی۔ وہ اُس کُتّے پر رحم کھا کر پھر اس کنویں میں اترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر اسے اپنے منہ سے تھام کر کنویں سے باہر نکل آیا اور اُس کُتّے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی (اس رحم دلی اور محنت کی) قدر فرمائی اور اس کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔ بعض صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ واقعہ سن کر دریافت کیا کہ: یارسول اللہ! کیا جانوروں کی تکلیف دور کرنے میں بھی ہمارے لیے اجر وثواب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! ہر زندہ اور تر جگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے) میں ثواب ہے۔'' (متفق علیہ)

چنانچہ مخلوقِ خدا کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ))(رواہ ابوداؤد والترمذی)

''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر خدائے رحمان رحم کرے گا۔ تم زمین پر بسنے والی اللہ کی مخلوق پر رحم کرو' آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

رحم دلی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اگر کوئی ضرورت مند کسی دوست یا بھائی سے قرض مانگے تو اسے قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرض خواہ کو اس کا اتنا ثواب ملتا ہے جتنا ہر روز صدقہ کرنے کا۔ اگر مقروض وعدے کے مطابق قرض کی رقم ادا نہ کر سکے اور مہلت کا طالب ہو تو اُسے مہلت دینا ایسا ہے جیسے ہر روز دگنی رقم خیرات کی جائے۔ یہ اس لیے کہ قرض دینے والے کو قرض واپسی تک انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے‘ جبکہ خیرات کرنے والا خیرات کر کے فارغ ہو جاتا ہے اور اسے کوئی انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

اللہ تعالیٰ کو انسان کا انسان کے ساتھ اور دوسری مخلوق کے ساتھ رحم کرنا بہت پسند ہے۔ اچھا انسان وہی ہے جسے دوسروں کی تکلیف کا احساس ہو اور ان کے ساتھ ہمدردی‘ غم خواری اور رحم دلی رکھتا ہو۔ بقول خواجہ میر درد ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

وہ شخص بُرا ہے جس میں رحم کا جذبہ نہیں اور دوسروں کو تکلیف دینے میں یا ان پر ظلم کرنے میں اُسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ بقول اقبال ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں‘ بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
مَیں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

المختصر‘ مخلوقِ خدا کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا اچھا انسان ہے اور مخلوقِ خدا کو دکھ دینے والا بُرا ہے۔

❁ ❁ ❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

صلہ رحمی

مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ زمین وآسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کو پیدا کیا۔ ہر مخلوق کو پیدا کر کے اسے اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ اس نے کس طرح اپنی رہائش کا بندوبست کرنا ہے؟ کہاں سے اپنے رزق کا بندوبست کرنا ہے؟ اپنی حفاظت کیسے کرنی ہے؟ پھر رہائش‘ رزق اور حفاظت کے لیے جن جن مادی اشیاء کی ضرورت تھی وہ تمام وسائل بھی مہیا کر دیے۔ انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب بندوبست اس لیے کیا کہ یہ تمام کائنات اور جو کچھ بھی اس میں ہے وہ اس کی تخلیق ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں ایک بناؤ‘ نظم اور سدھار چاہتا ہے۔ وہ بگاڑ کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اگر سطحی طور پر کہیں بگاڑ نظر بھی آتا ہے تو دراصل وہ ایک نئی تعمیر کے لیے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾﴾ (الرحمٰن) ’’ہر روز اُس کی ایک نئی شان ہوتی ہے۔‘‘ پھر جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل میں وارد ہوا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾﴾

’’اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور انہیں خشکی اور سمندر میں سواریاں مہیا کی ہیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے اور ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔‘‘

اسی فضیلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے دوسری مخلوقات سے زیادہ علم دیا اور ان میں رسولوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انسان کو اختیار دیا کہ چاہے وہ اطاعت گزار بندہ بن کر اس دنیا میں زندگی گزارے چاہے سرکش بن کر۔ چاہے تو اس دنیا کے بناؤ اور ستھراؤ کی فکر کرے اور اعلیٰ کردار اور اعلیٰ اخلاق اپنائے‘ چاہے تو بگاڑ کی روش اختیار کرے اور پست کردار اور پست اخلاق اپنا لے۔ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کو اس بات کی سمجھ

آ جاتی ہے اور وہ اس کے فرماں بردار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ان کو ’’اولوالالباب‘‘ کا خطاب دیا گیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ارشادِ گرامی ہے:

﴿اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ کَمَنۡ ہُوَ اَعۡمٰی ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا وہ حق ہے‘ بھلا اُس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ یقیناً نصیحت تو عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔‘‘

سمجھ دار لوگ اللہ کی محبّت کے جذبے سے سرشار ہو کر اُس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اُس کی فرماں برداری کرتے ہوئے وہ بھی اس دنیا میں بناؤ‘ نظم اور سدھار کی کوشش کرتے ہیں۔ خود بھی بگاڑ کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنی حدِّ استطاعت اسے رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانوں میں بناؤ سنگھار اور سدھار ’’صلہ رحمی‘‘ جبکہ بگاڑ و بدنظمی ’’قطع رحمی‘‘ کہلاتا ہے۔ صلہ رحمی نہ صرف انسانوں کے درمیان مطلوب ہے بلکہ از روئے احادیث حیوانات اور نباتات بھی اس میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اولوالالباب کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ وَ یَخَافُوۡنَ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ ﴿۲۱﴾﴾ (الرعد) ’’اور وہ لوگ جوڑتے ہیں اُس کو جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے‘ اور جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں بُرے حساب کا۔‘‘ یعنی جوڑنے اور صلہ رحمی کا عمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اللہ ربّ العالمین کی خشیت حاصل ہوتی ہے اور جو قیامت کے دن بُرے حساب سے ڈرتے ہیں۔ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ سے مراد ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی گرفت ہو جائے‘ جبکہ اہلِ ایمان کے ساتھ حسابًا یسیرًا کا معاملہ ہوگا۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر کیا جائے گا۔ اعمال پر سرسری نظر ڈال کر جنّت میں بھیج دیا جائے گا۔ اَللّٰھُمَّ حَاسِبۡنَا حِسَابًا یَسِیۡرًا ’’اے اللہ! ہم سے آسان حساب کتاب کا معاملہ فرما۔‘‘

صلہ رحمی کا عمل قریبی رشتہ داروں سے شروع ہو کر تمام انسانیت تک محیط ہے۔ جو ہمارے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ ہماری صلہ رحمی کا مستحق ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ صلہ رحمی کا یہ عمل بے تحاشا صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ صلہ رحمی کرنے کے لیے اپنے اوپر جبر کرنا پڑتا ہے۔ خاندانی معاملات میں بسا اوقات ہمیں رشتہ داروں کی جلی کٹی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ ان کی

باتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کر کے ترکی بہ ترکی جواب نہ دینا' ان سے میل ملاقات اسی طرح جاری رکھنا' یہ سب ممکن ہی نہیں جب تک یہ سارا عمل خالصتاً اللہ کو راضی رکھنے کی نیت سے نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾﴾ (الرعد)

''اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے' اور نماز قائم کی' اور خرچ کیا اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا تھا پوشیدہ طور پر بھی اور اعلانیہ بھی' اور وہ بھلائی سے برائی کو دور کرتے ہیں' یہی لوگ ہیں جن کے لیے دارِ آخرت کی کامیابی ہے۔''

یہ اولوالالباب' یہ سمجھدار' یہ صلہ رحمی کرنے والے صرف اور صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے صبر کرتے ہیں۔ یہ صبر ان کو نماز قائم کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ بُرائی کو بھلائی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کی طرف سے ایذا رسانی کے باوجود ان کے اوپر خفیہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جنّت کا وعدہ ہے' اور جنّت میں بھی انتہائی اعلیٰ مقام۔ ان لوگوں پر اللہ کا مزید انعام یہ ہوگا کہ جنّت کے اس اعلیٰ درجہ میں ان کے والدین' اولاد اور بیویوں کو بھی داخل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ جنّت کے ادنیٰ درجہ میں دخول کی اہلیت رکھتے ہوں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾﴾ (الرعد)

''(آخرت کا گھر) وہ باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے' جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو بھی صالح ہوں گے ان کے آباء' ان کی بیویوں اور ان کی اولادمیں سے' اور ہر دروازے سے جنّت کے فرشتے ان کے سامنے حاضر ہوں گے۔''

صلہ رحمی کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ کسی کا سلوک ان کے ساتھ کیسا ہے۔ وہ تو بس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لوگوں کے درمیان محبّت' بناؤ اور سدھار چاہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ' وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الذي إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ

وَصَلَهَا)) (رواہ البخاری)

''وہ آدمی صلہ رحمی کا حق ادا نہیں کرتا جو (صلہ رحمی کرنے والے کے ساتھ) بدلے کے طور پر صلہ رحمی کرتا ہے۔ صلہ رحمی کا حق ادا کرنے والا دراصل وہ ہے جو اس حالت میں صلہ رحمی کرے اور قرابت داروں کا حق ادا کرے جب وہ اس کے ساتھ قطع رحمی اور حق تلفی کا معاملہ کریں۔''

ظاہر ہے کہ قطع رحمی اور حق تلفی کرنے والوں کے ساتھ جب جوابی طور پر قطع رحمی ہی کا برتاؤ کیا جائے گا تو یہ بیماری اور گندگی معاشرے میں اور زیادہ بڑھے گی۔ اس کے برعکس جب ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے گا تو اُمید ہے کہ جلد یا بدیر ان کی اصلاح ہوگی اور معاشرے میں صلہ رحمی کو فروغ حاصل ہوگا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ جو لوگ بناؤ اور سنوار کے بجائے بگاڑ کی روش پر قائم ہوں اور کسی بھی وقت ان کو اس کا ادراک ہو جائے' پھر وہ صحیح راستے کی طرف پلٹنا چاہیں اور اپنی گزشتہ روش پر شرمندہ بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہو کر ان کو واپس پلٹنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ ان کے پچھلے تمام بُرے کاموں کو معاف کر دیتے ہیں۔ شرط صرف یہی ہے کہ وہ سچے دل سے نادم ہوں اور آئندہ اپنی روش درست کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ یہی توبہ کا فلسفہ ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝﴾ (الفرقان)

''ہاں مگر جو کوئی توبہ کرے' ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

البتہ جو لوگ بگاڑ کی روش پر قائم رہیں' صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کریں' یہاں تک کہ اسی حالت میں انہیں موت آ جائے تو ان کی سزا جہنم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ۝٢٥﴾ (الرعد)

''اور (اس کے برعکس) وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو اسے مضبوطی سے

باندھنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان (رشتوں) کو جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے ہیں' یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہوگی اور ان کے لیے برا گھر (جہنم) ہے۔''

گویا صلہ رحمی نہ کرنے والے لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ کی لعنت اور آخرت میں بُرا ٹھکانا ہے۔

آیئے حضور اکرم ﷺ کے مزید ارشادات کی روشنی میں صلہ رحمی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ حضرت جبیر بن مطعم ؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ)) (صحیح البخاری) ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

معلوم ہوا کہ قطع رحمی اللہ کے نزدیک اتنا سخت گناہ ہے کہ اس کی گندگی کے ساتھ کوئی جنت میں نہ جا سکے گا۔ ہاں جب اس کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے یا اللہ اپنی رحمت سے اس کو معاف کر دے تو جا سکے گا۔ جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ ہو' جنت کا دروازہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ له فِي رِزْقِهِ' وَأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ' فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ)) (متفق علیه) ''جو کوئی یہ چاہے کہ اُس کے رزق میں کشادگی ہو اور دنیا میں اُس کی عمر لمبی ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔''

اس حدیث سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ بعض نیک اعمال کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی برکتوں سے نوازتا ہے۔ اہلِ قرابت کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک وہ مبارک عمل ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی اور برکت ہوتی ہے۔ صلہ رحمی کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ آدمی اپنی کمائی سے اہلِ قرابت کی مالی خدمت کرے' دوسرے یہ کہ اپنے وقت اور اپنی زندگی کا کچھ حصّہ ان کے کاموں میں لگائے۔ اس کے صلے میں رزق و مال میں وسعت اور زندگی کی مدت میں اضافہ اور برکت اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے عین مطابق ہے۔

خاندانی جھگڑے اور خانگی الجھنیں جو زیادہ تر حقوقِ قرابت ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں' آدمی کے لیے دلی پریشانی' اندرونی کڑھن اور گھٹن کا باعث بنتی ہیں۔ یہ کاروبار' ملازمت اور صحت کو متاثر کرتی ہیں۔ جو لوگ اہل خاندان اور اقارب کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کا

برتاؤ کرتے ہیں‘ ان کی زندگی انشراح وطمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے۔ان کے حالات ہر لحاظ سے بہتر رہتے ہیں اور فضلِ خداوندی ان کے شاملِ حال رہتا ہے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الرَّحِمَ شَجْنَۃٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ ' فَقَالَ اللّٰہُ : مَنْ وَصَلَکِ وَصَلْتُہٗ وَمَنْ قَطَعَکِ قَطَعْتُہٗ)) (صحیح البخاری)

’’رحم (یعنی حق قرابت) مشتق ہے رحمان سے اور اس نسبت سے اللہ نے اس سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا مَیں اُسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا مَیں اُسے توڑوں گا۔‘‘

یعنی انسان کی باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمٰن سے اور اس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔اس خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے گا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا‘ اس کو وہ اپنے سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا۔اس کے برعکس جو کوئی قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا‘ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے کاٹ کر دُور اور بے تعلق کر دے گا۔اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین میں صلہ رحمی کی کتنی اہمیت ہے اور اس میں کوتاہی کتنا سنگین جرم اور کتنی بڑی کوتاہی ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفیق ہونے کی حیثیت سے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم رشتہ داروں کے ساتھ معاملات میں ان سے بڑھ کر صلہ رحمی کا مظاہرہ کریں‘ کیونکہ ان کے ساتھ ہمارا تعارف بطور تنظیم کے رفیق کے بھی ہے۔ ہماری جانب سے صلہ رحمی کے مظاہرہ سے ان پر تنظیم کی اہمیت بھی واضح ہوگی کہ اس کے رفیق ہونے کی وجہ سے ہمارے اندر یہ تبدیلی آئی ہے۔ ہمارے اس طرزِ عمل سے ان تک تنظیم کی خاموش دعوت بھی پہنچے گی۔مزید برآں صلہ رحمی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہم اپنے رشتہ داروں کو پوری دل سوزی‘ خیر خواہی‘ غم خواری اور ہمدردی کے ساتھ تنظیم کی فکر سے آگاہ کریں۔انہیں ان کے دینی فرائض یاد دلائیں اور تنظیم میں شمولیت کی دعوت دیں۔البتہ ہماری یہ دعوت بھی تبھی کارگر ہوگی جب ہم ان کے ساتھ معاملات میں صلہ رحمی کا مظاہرہ کر رہے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قطع رحمی سے محفوظ رکھے اور صلہ رحمی کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یاربّ العالمین! ❁❁

اسلامی معاشرت میں بچوں کا مقام

مولانا عبدالمتین

سیّدنا انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا)) (سنن الترمذی)

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑوں کی عزّت نہ جانے۔''

حدیث میں ''لَيْسَ مِنَّا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طریقے سے ہٹا ہوا ہے اور اُس کا یہ فعل نبی اکرم ﷺ کی سکھلائی ہوئی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلام میں معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے اور اسی ضمن میں اس حدیث مبارکہ میں خاص طور پر چھوٹے اور بڑے افراد کا حق ذکر کیا گیا ہے۔ چھوٹوں سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو ہم سے عمر میں چھوٹے ہیں۔

محبّت وشفقت اور لحاظ ومروّت

بڑوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ چھوٹوں پر کسی طرح کی زیادتی نہ کریں۔ یہ رویہ کہ جو منہ میں آیا سنا دیا' یا جب جی چاہا مار دیا' ان کے حق میں بالکل بھی درست نہیں۔ ہم چھوٹوں پر کوئی بھی زیادتی اُن کی جسمانی یا ذہنی کمی کے سبب یہ سوچ کر کر لیتے ہیں کہ وہ نہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے اور نہ ہی مجھے جواب دے سکتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ بچہ اپنی جسمانی یا شعوری کمزوری کے سبب باقاعدہ بدلہ تو نہیں لیتا لیکن تجربہ شاہد ہے کہ وہ یہ سب حرکات وسکنات نوٹ کر رہا ہوتا ہے اور اپنے شعور یا لاشعور میں ان کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ موقع ملنے پر وہ ایسے تمام رویوں کا بھرپور انتقام کسی دوسرے وقت پر کسی دوسرے شخص سے ضرور لیتا ہے۔ اس کی چند مثالیں اس طرح ہیں:

(۱) جب اس بچّے کا واسطہ اپنے سے چھوٹے کے ساتھ پڑتا ہے تو وہ وہی کارروائی دہراتا ہے جو اس کے ساتھ کی گئی تھی۔

(۲) جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اپنے سے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا بلکہ غیر معیاری تربیت اس کے مزاج کا حصّہ بن جاتی ہے۔

(۳) یہی بچّے بڑے ہو کر اپنی انا اور طاقت کے استعمال ہی کو متاعِ کل تصور کر لیتے ہیں جس سے آئندہ آنے والی پوری نسل غلط تربیت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ اس بات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ بچّے پر بے جا سختی اور زیادتی نہ کی جائے‘ کیونکہ اس کے بد اثرات اگلی نسلوں تک منتقل ہو سکتے ہیں۔

درگزر اور اعتماد

ایک اہم معاملہ بچوں کی شرارت کا ہے۔ ہم بچّے کی ہر حرکت کو شرارت اور بدتمیزی کا نام دے دیتے ہیں اور جب تک اس فعل پر کڑا کے دار نفی کی ڈانٹ نہیں لگاتے‘ بے چین رہتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق بچوں سے بہت زیادہ منفی اسلوب میں بات کرنا بہت نقصان دہ ہے۔ یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ بچّے کا ہر کام شرارت کے ذیل میں نہیں آتا۔ بچّے کا ہلچل‘ کھیل کود‘ مقابلہ وغیرہ کرنا اُس کی عمر کا تقاضا ہے۔ اسے بدلنے کی کوشش کرنا اور ایک بچّے سے درویش یا صوفی بننے کی تمنّا رکھنا یکسر غلط اور غیر حقیقی طرزِ عمل ہے۔

بچہ کھیل کود کرے تو وہ غلطی نہیں ہے‘ البتہ اگر وہ واقعی کوئی نامناسب کام کرے تب اسے تنبیہہ ضرور کرنی چاہیے۔ اس میں بھی کچھ باتوں کا خیال رہے کہ پہلی مرتبہ اسے کبھی بھی مارا نہ جائے بلکہ سمجھایا جائے۔ اگر اس کا اثر محسوس نہ ہو تو مناسب الفاظ میں ڈانٹ پلائی جائے۔ یہ احساس دلایا جائے کہ اس پر ایک سرپرست کی بھرپور نظر ہے اور اگر آئندہ ایسا کچھ ہوا تو مزید سختی سے پیش آیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ غلطی پر مصر رہے تو ہلکی پھلکی مار پیٹ کی جا سکتی ہے‘ لیکن اس کے ساتھ ڈانٹ پر زیادہ زور رہے۔ اس کے بعد بھی اگر ایسا ہو تو ذرا سخت مار جس میں چہرے اور سر پر ضرب نہ لگے‘ نہ ہی کسی ڈنڈے وغیرہ کا استعمال ہو اور نہ ہی یہ عمل رشتہ داروں یا اس کے دوستوں کے سامنے ہو‘ تاکہ اُس کی عزّتِ نفس مجروح نہ ہو۔

مار پیٹ بلاضرورت نہ ہو‘ بار بار نہ ہو‘ بغیر تنبیہہ کے نہ ہو۔ اپنی طاقت اور بڑے پن کے نشے میں مست ہو کر یا اپنا غصہ نکالنے کے لیے ہرگز نہ ہو۔ بچہ اگر اس مار پیٹ کا عادی ہو گیا تو ایک وقت آئے گا کہ جب اس کے دل سے اس تعزیر کا خوف نکل جائے گا۔ پھر وہ ہر بُرے کام کا

ارتکاب نڈر ہوکر کرے گا۔ ایسی صورت میں بالآخر وہ معاشرے کے لیے ایک ناسور ثابت ہوگا۔

بچّے کی نشوونما میں اعتماد کا بڑا عمل دخل ہے۔ ہم جتنا بچّے پر اعتماد کریں گے اتنا ہی اس کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ بچّے کے نمبر کم آئے ہوں یا اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور اس پر وہ شرمندہ ہو کر آئندہ غلطی نہ دہرانے کا عزم کرے تو اُسے بھرپور موقع دے کر معاف کر دیا جائے۔ اس کی صلاحیت کے موافق بھرپور اعتماد سے کام لیا جائے تو وہ چوری چھپے کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنے ہر مسئلے پر آپ سے بات کرے۔ یہ عمل اسے کسی بھی برے انجام سے محفوظ رکھے گا۔ لڑکپن (teenage) یعنی ۱۳ تا ۱۹ سال کے دور میں بچوں پر خصوصی توجہ دینا لازمی ہے۔ اگر وہ اس اہم مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی آپ سے جڑے ہوئے ہیں' آپ سے اپنی ہر بات شیئر کرتے ہیں اور کوئی کام آپ کی اجازت اور سرپرستی کے بغیر نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تربیت کا عمل کامیابی کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے۔

بچّے: مَن کے سچّے

بچّے نہایت سچے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی کم عمری اور معصومیت کے باعث وہ معاشرے کی جھوٹی اور نفاق بھری آلودگی سے محفوظ رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارا طرزِ عمل اور ہمارے رویے ان کے سامنے معاشرے کی عملی تصویر پیش کرتے ہیں جس کے سبب وہ فطرتِ سلیمہ پر قائم نہیں رہتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچہ انتہائی غور وخوض سے کام لیتا ہے۔ اپنے کانوں سے زیادہ وہ اپنی آنکھوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ دیکھ دیکھ کر سیکھتا ہے اور اسی دیکھے ہوئے کو دہراتا ہے۔ ہم اسے ایک بات کی سو بار نصیحت کریں' لیکن جب تک ہم خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے تب تک وہ اس فعل کو غیر اہم سمجھتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ یہ اتنا ہی ضروری کام ہوتا تو آپ خود ضرور کرتے۔ ہماری گفتگو' نشست و برخاست' دلچسپی' رجحانات' معاملات سب بچّے کی نظر میں رہتے ہیں۔ لہٰذا تربیت کے عمل میں اس بات کا لازمی دخل ہے کہ ہم خود کیا ہیں! ''ہمارے بچّے کیسے ہیں!'' یہ دوسرا سوال ہے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنی تیاری کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے اپنے آپ پر محنت نہ کی تو ایک پوری نسل تباہی کے گھاٹ اُتر سکتی ہے۔

❀❀❀

سانحۂ کربلا
شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص: 215 روپے اشاعت عام: 125 روپے
(علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 49 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد و خواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف و نحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
- سیرت و شمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث و اصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان و ادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 15 اگست

آغازِ کلاسز 16 اگست 2023 (ان شاء اللہ)

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 8:15 بجے تا 12:50

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے اپنی رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) لاہور

مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3

July 2023
Vol.72

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly **Meesaq** Lahore